Women Writ[...]
Classi[...]

افسانے

بڑی شرم کی بات

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS
Low Priced Series

بڑی شرم کی بات

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

1008

بڑی شرم کی بات

ترتیب

بڑی شرم کی بات

رات کے سناٹے میں فلیٹ کی گھنٹی زخمی بلاؤ کی طرح غرا رہی تھی۔ لڑکیاں آخری شو دیکھ کر کبھی کی اپنے کمروں میں بند سو رہی تھیں۔ آیا چھٹی پر گئی ہوئی تھی اور گھنٹی پر کسی کی انگلی بے رحمی سے جمی ہوئی تھی۔ میں نے لشتم پشتم جا کر دروازہ کھولا۔

ڈھونڈی چھوکرے کا ہاتھ تھامے دوسرے ہاتھ سے چھوکری کو کلیجے سے لگائے جھکی جھکی گھسی اور بھاگ کر نوکروں والے غسل خانے میں لیٹ ہو گئی۔ دور سڑک پر غول بیابانی کا شور اے روڈ کی طرف لپکا چلا آ رہا تھا۔ میں نے بالکنی سے دیکھا عورتیں، بچے نشہ میں دھت نوکر بے تحاشہ بولیوں میں نہ جانے کسے للکارتے چلے آ رہے تھے۔

چوکی دار شاید اونگھ گیا تھا تبھی ڈھونڈی اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھس پڑی۔ وہ اس کے پیچھے لپکنے کے بجائے پھاٹک میں تالے جڑنے دوڑا اور جب مجمع کمپاؤنڈ کی دیوار پر چڑھ کر پھاندنے لگا تو اس نے لپک کر لوہے کا اندرونی دروازہ بند کر لیا اور سلاخوں میں سے حملہ آوروں کو ڈنڈے سے دھمکانے لگا۔

ادھر سے محفوظ پا کر میں نے جلدی جلدی بجلیاں جلائیں۔ غسل خانہ سے ملا ہوا جو کوڑے کباڑ کا چھوٹا سا حصہ ہے اس میں ڈھونڈی میلے کپڑوں کی ٹوکری سے چپکی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی لہولہان تھی اور خون گردن سے بہہ کر شلوکہ اور دھوتی کو تر کر رہا تھا۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ کیا معاملہ ہے مگر اس کے آنکھیں پھٹی تھیں اور جوڑی سوار تھی۔ بچی پھٹی ہوئی چولی سے فائدہ اٹھا رہی تھی اور بڑی تندہی سے اپنی ازلی بھوک مٹانے میں مشغول تھی۔ چھوکرا حسبِ عادت ناک سڑک رہا تھا اور پیشاب سے تر ٹانگیں کھجا رہا تھا۔

ڈھونڈی کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب اس کا پتی راؤ چوتھے مالے کے سیٹھ کی ڈرائیوری کرتا تھا۔ نام سے تو لگتا ہے ڈھونڈی کوئی لحیم شحیم مردمار قسم کی گھاٹن ہو گی مگر ڈھونڈی کا قد مشکل سے چار فٹ ہو گا۔ جی بھر کے بدصورت، چپیاں سی آنکھیں، آگے کو کھسکا ہوا نچلا جبڑا اور دھنسا ہوا ماتھا۔ چند ماہ پہلے ہی ایک عدد لونڈیا جنی تھی تو راؤ نے دارو پی کر اس کی ہڈی پسلی نرم کر دی تھی۔ ڈیڑھ ماہ کی سوکھی ماری بچی نہ جانے رات کو کب مر گئی۔ اور ڈھونڈی ڈاڑھیں مار مار کر روئی۔

بائی لوگ کا کہنا تھا کہ ڈھونڈی نے ٹوپادے کے بچی کی چھٹی کر دی۔ یعنی رات کو چپکے سے گلا دبا دیا۔ مگر ایسی بات ہوتی تو پھر اتنا ماتم کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

ڈھونڈی کا مرد ایک دم موالی تھا۔ بہت دارو پیتا تھا۔ مگر ڈھونڈی کہتی تھی رات کی ڈردی کرتا ہے۔ سیٹھ ساری ساری رات چھوکریوں کی سنگ ٹھٹھا کرتا ہے۔ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے اوب جاتا ہے تو پوا مار لیتا ہے۔ بمبئی کی شاید ہی کوئی بلڈنگ ہو جس کے احاطے کے کسی کونے میں اندھیری گیرج میں یا نوکروں کی کوٹھری میں حتیٰ کہ گندے سنڈاسوں میں دارو نہیں کشید کی جاتی۔ اور پھر ادھر ورلی کے سنسان علاقے میں ڈانڈا کی طرف جانے والی سڑک پہ جھونپڑ پٹی میں تو باقاعدہ ٹھرے کی بار جمی ہوئی ہیں--- مکھن میں تلی ہوئی کیا فرسٹ کلاس مچھلی کھانا ہو تو ڈانڈا سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ وہاں مختصر ترین چولی اور لنگوٹی پہنے مچھیرنوں کا اکھے بمبئی میں جواب نہیں۔ ادھر جو نئے فلیٹ بن رہے ہیں ان میں سیٹھ لوگ اپنی رکھیل رکھتے ہیں۔ سیٹھانیوں کی جاسوسی کارروائیوں سے محفوظ یہ سیٹھ لوگ جو فلم کا دھندا کرتے ہیں، یعنی ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر کے بیچ کے کنڈے جو فلم کے علاوہ چھوکری سے لے کر ہٹ فلموں تک کا لین دین پٹاتے ہیں۔

سیٹھ لوگ جب اوپر چلے جاتے ہیں تو نیچے اترنے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔ نیچے ڈرائیور جوا اور شراب کا دور چلاتے ہیں۔ وہیں سے راؤ کو شراب کی عادت نے پکڑ لیا۔ پھر یہ عادت اتنی بڑھی کہ ڈھونڈی کی سوت بن بیٹھی۔

بچی کے مرنے کے چند مہینے بعد ڈھونڈی کا پیر پھر سے بھاری ہو گیا۔ اب کے

راؤ نے الٹی میٹم دے دیا کہ اگر پھر چھوکری ڈالی تو وہ اس کا پتہ کاٹ کے دوسری بہو کرے گا--- لیکن چھوکری پیدا ہونے سے پہلے ہی ایک دن راؤ نے بچوں کو اسکول سے لاتے سے گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا دی- بچوں کے چوٹ تو نہیں لگی مگر ہائے توبہ اتنی مچائی کہ سیٹھ نے اسے کھڑے کھڑے نکال دیا-

راؤ اور ڈھونڈی کو گیرج خالی کر کے جانا پڑا- جس پر اسی دن نئے ڈرائیور نے قبضہ کر لیا-

ایک دن کیا دیکھتی ہوں ڈھونڈی ایک چھپکلی کی شکل کی چھوکری چھاتی سے چپکائے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والی ترکاری والی کے پاس جمی ہوئی ہیں- اجاڑ صورت' گھسٹی ہوئی-

"ارے ڈھونڈی کیسی ہے ری-" میں نے رسماً پوچھ لیا-

"ٹھیک ہے بائی-" وہ اٹھ کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگیں-

"راؤ کیسا ہے؟"

"او تو گیا بی-"

"کدھر گیا؟"

"سمندر پار دبئی کو-"

"تو کم بخت بچی کی وجہ سے تجھے چھوڑ گیا-"

"نئیں بائی چھوکری تو بعد میں آئی- وہ تو پیسہ کمانے کو گیا-"

"اہو تب تو ٹھاٹھ ہوں گے تیرے- بہت روپے بھیجتا ہو گا تجھے-"

"نئیں بائی- اسے اپنی آئی کو بھیجتا-"

"اس کی ماں یعنی تیری ساس کو؟" مراٹھی میں آئی ماں کو کہتے ہیں-

"نئیں' وہ لچی جو اسے ادھر بھجوایا-" تو ڈھونڈی صاحبہ طنز فرما رہی تھیں-

"ادھر ڈانڈا میں دونوں کا لفڑا چلتا تھا- جانے سے پہلے راؤ نے بیاہ کیا اس سے اور....."

"مگر دوسری شادی تجھے طلاق دیئے بنا کیسے کر سکتا ہے- ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی

سور کو۔"

"کون ڈالتا ہتھ کڑی بائی۔"

"ارے دس بارہ سال ہوئے قانون پاس ہوا کہ ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت نہیں۔ طلاق بغیر دوسری شادی جرم ہے۔"

"کائے کو؟ اکھا گجراتی' مراٹھی' سندھی اور بھیا لوگ کتنی شادی بناتا۔"

"سب پر کیس چل سکتا ہے۔"

ڈھونڈی قطعی ماننے کو تیار نہ تھی اور نہ میرے پاس وقت نہ وسیلہ کہ اسے قانون سمجھاتی پھروں۔ خود میرے جان پہنچان کے معزز لوگوں کے پاس ایک بیوی کے علاوہ اور کئی عورتیں ہیں۔ سنا ہے پنڈت سے پھیرے ڈلوا لو' کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ جی کو تسلی بھی ہو جاتی ہے کہ معاملہ حلال ہو گیا۔

"بائی میرے کو کام دیو۔" ڈھونڈی پیچھے پڑ گئی۔ میری پرانی جھاڑو کٹکا کرنے والی بائی ڈھونڈی کو میرے ساتھ دیکھتے ہی دولتیاں جھاڑنے لگی۔ اور دونوں میں نہایت فراٹے کی مراٹھی میں جنگ شروع ہو گئی۔ میں اتنے سال سے بمبئی میں رہتی ہوں' کوئی رسان رسان بولے تو مراٹھی' گجراتی' سندھی' بنگالی خاصی پلے پڑ جاتی ہے۔ مگر جب انہیں زبانوں میں تو تو میں میں شروع ہو جاتی ہے تو میرے خاک سمجھ میں نہیں آتی۔ انتہائی روح فرسا پتھریلی چیخوں میں تو ہر لفظ گالی بن کر کان کے پردے پھاڑنے لگتا ہے۔ جیسے بنا ٹائر کی گاڑی کھڑنجے پر دوڑ رہی ہو۔

میں دونوں کو ڈانٹ کر الگ کیا۔ بالشت بھر کی ڈھونڈی چھوکری کو سیڑھی پر ٹکا کر لانگ کس رہی تھی۔ اور ڈھائی من کی دھوبن کسما بائی چاولوں کی بوری دیوار سے ٹکا کر خم ٹھوکا چاہتی تھی۔ بڑی مشکل سے دونوں کو ٹھنڈا کیا اور ڈھونڈی کو سمجھایا کہ کسما بائی کی شان میں کچھ بھی کہا تو اچھا نہ ہو گا۔ وہ تین برس سے میرے ہاں لگی ہے۔

برسات شروع ہوتے ہی بمبئی میں بائی لوگ کا بھاؤ گرنے لگتا ہے۔ سہانے جاڑوں اور گرمی میں آنکھ لگانے کو بائی نہیں ملتی۔ تب نہ بنا لائسنس کی چھابڑی

لگائی جا سکتی ہے۔ نہ کیچڑ پانی میں لتھڑے ہوئے باغ باغیچے، سنسان کونے کھترے، سمندر کے کنارے اونچے نیچے چٹان کسی بھی سہاونے دھندے کیلئے کام نہیں آ سکتے۔ فلیٹوں کی اگاسیوں میں مستقل والے نوکر جمے ہوتے ہیں۔ ہاں ان دنوں باورچی لوگ کے عیش ہوتے ہیں۔ اور جب مالک مکان سو جاتے ہیں تو باورچی کچن میں راجہ اندر بنے مزے اڑاتے ہیں۔ بچا کھچا کھانا بڑی دریا دلی سے اپنی پریمکاؤں کو نگلا دیتے ہیں۔ کبھی چار پانچ لفنگے جمع ہو کر جواء شراب سے شوق فرماتے ہیں اور اگر گرمی میں ایئر کنڈیشن کمروں میں صاحب لوگ بند ہوں تو ڈرائنگ روم میں بستر لگ جاتے ہیں۔ جو صبح دودھ لانے کے وقت خالی کر کے صفائی ہو جاتی ہے۔

شکر ہے برسات کے بہاؤ میں چھپکلی کی صورت کی چھوکری بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سڑی گلی ڈسٹ بن میں پھینکی ہوئی ترکاریوں کے چھلکوں کی بھاجی کھانے والی ماں کا دودھ پی کر موٹا تازہ بچہ بھی دم توڑ دیتا وہ تو پھر بھی ناچیز چھپکلی تھی۔

بچی کی موت نے جیسے ڈھونڈی کے دن پھیر دیئے کہ بائی لوگ کے مختلف دھندے جاگ اٹھے اور نوکروں کا توڑا پڑ گیا۔ ڈھونڈی نے بلڈنگ کے چھبیس فلیٹوں میں سے آٹھ دس مار لیے اور صبح سے شام تک کپڑا برتن جھاڑو کٹکا کر کے خوب کمانے لگی۔

راؤ نے روپیہ بھیج کر اپنی محبوبہ کو پردیس بلا لیا اور ڈھونڈی نے لال ہری دھوتیاں خرید کر ترکاری والی بائی کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ جہاں بوجھ بجھکڑ یعنی شنکر کی بوڑھی ماں ناتجربہ کار بائی لوگ کو زندہ رہنے کے تیر بہدف نسخے بانٹتی۔ ڈھونڈی بڑے دھیان سے اس کے بھاشن سنتی اور سر دھنتی۔

کام نمٹا کر یہ بائی لوگ شام کو نہا دھو کر سولہ سنگار کرتی ہیں۔ نکڑ سے پان کے بیڑے خرید کر کلا گرم کرتی ہیں اور تازی ہوا کھانے میرین ڈرائیو پر سمندر کے کنارے منڈیر پر بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتی ہیں۔ کھل کر ہنستی بولتی ہیں۔ راہ گیروں سے آنکھیں بھی لڑاتی ہیں۔ وہیں پہلی بار چھ فٹ اونچے رگھو ناتھ گھاٹے سے ڈھونڈی کی آنکھ میں لڑ گئی۔ راؤ کے بعد اسے مرد کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کی مہلت

ہی نہ ملی تھی۔ تین چار بار رگھو اس کے سامنے سے بڑے بانکپن سے ترچھی نظر ڈالتا گذرا۔ ایک بار ٹھہر کر بیڑی بھی سلگاتا رہا۔ پھر کچھ دور منڈیر پر بیٹھ گیا۔ دو چار دن میں دوری کم ہوتی گئی اور قربت بڑھتی گئی۔ کبھی پکوڑیاں سینگ چنا بھی پیش لیا۔ پہلے تو ڈھونڈی سر ہلاتی رہی تھی۔ شنکر کی ماں کی آنکھ کا اشارہ پا کر کانپتے ہاتھوں سے دو چنے بھی اٹھا لیے جو اس کی مٹھی میں پسیجتے رہے۔ منہ میں ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔۔۔۔ قصہ مختصر ایک دن گھنٹی بجی، کھولنے پر چھ فٹ اونچے رگھو کے ساتھ چار فٹ کی ڈھونڈی شرمائی لجائی کھڑی تھیں۔

"بائی ہم سادی بنایا۔ گنگا بائی کو بولایا، کل سے وہ کام پہ آئے گی۔" انہوں نے کچھ سرپٹ مراہٹی میں دولہا میاں کو کچھ ہدایات دیں اور خود اندر آ گئیں۔

"ہمارا حساب کر دیو بائی۔ تیس روپیہ مہینہ کے حساب سے پچیس دن کے پچیس ہوتے تھے۔ میں نے دس دس کے تین نوٹ پکڑا دیے۔ ڈھونڈی کے مکھ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ جھوٹے تلے کی لال لانگ والی نوگری دھوتی اور اودی چولی میں ڈھونڈی کا سیاہ رنگ پھوٹا نکل رہا تھا۔ بالشت بھر کی مہا بدصورت عورت میں بلا کی سیکس اپیل تھی۔ پتلی کمر بھاری کولہے، پیروں میں نئے چاندی کے توڑے ماتھے پر اٹھنی برابر سندور کا ٹیکہ سو سو بہاریں دکھا رہا تھا۔ بار بار منگل سوتر کو چھو رہی تھی جیسے اطمینان کرنا چاہتی ہو کہ معاملہ قطعی معقول ہے۔

یاد نہیں کئی سال گزرے کہ ایک دن چلی آ رہی ہیں بی ڈھونڈی۔ پونے دو برس کے چھوکرے کا ہاتھ تھامے پورے دن کا پیٹ سنبھالے، منہ پر ٹھیکرے ٹوٹ رہے تھے۔ منگل سوتر غائب پیروں کے توڑے اڑن چھو۔

"بائی کوئی کام دیو۔"

گنگا بائی نے اپنے وجود کا اعلان ایک عدد چھینک سے دیا اور چائے کی ٹرے تیپھا" میز پر ایک جھٹکے سے پٹخ دی تاکہ میں ان کے ری ایکشن کو نوٹ کر لوں۔

"کیا ہوا ڈھونڈی؟ رگھو ناتھ کا کیا حال ہے؟"

جواب میں انہوں نے سرپٹ مراہٹی میں جواب کھڑکھڑایا۔ ساؤنڈ افکٹ

سے میں نے فوراً ان کا مطلب سمجھ لیا، معاملہ گمبھیر ہے۔

جب بیاہ کر سسرال پہنچیں تو پتہ چلا کہ رگھو کی بیوی میکے پٹخوا دی گئی تھی کیوں کہ اس کی ساس سے ایک منٹ نہیں بنتی تھی۔ چار چوٹ کی مار دیتی تھی۔ اب ڈھونڈی کو بھی مارتی تھی ہلکٹ۔ اتنے برس بمبئی میں رہی اور ہلکٹ کے معنی بھی میرے پلے نہیں پڑے۔ ہاں اتنا پتہ چلا کہ ہلکٹ کے معنی بہت ہی خراب، بدمعاش، مرکھنی چال باز عورت۔

"اس نے مجھے مارا اور پٹ لی، تو بھی مارتی بڑھیا کو۔"

"کاہے کی بڑھیا، بس ڈھونڈی سے سال دو سال چھوٹی ہی ہو گی۔ لمبی تڑنگی مرد مار عورت پھونک مارے تو ڈھونڈی جیسی چوہیا وہ جائے۔ بڈھے کو روز نوٹاک منگتا ہے۔ یعنی اگر ٹھرّے کا پوا نہ ملے تو طوفان برپا کر دیتا ہے۔ اس کی عورت تو رگھو دس بارہ سال کا تھا تب ہی خلاص ہو گئی تھی۔ اس کے بعد رگھو کا باپ ادھر ادھر منہ مارتا رہا۔ راج مزدور کا کام کرتا تھا۔ بمبئی میں بڑے زوروں سے بلڈنگیں کھڑی ہو رہی تھیں۔ خاک دھول پھیپھڑوں میں جمتی گئی، سیلن کی وجہ سے گٹھیا بھی ہو گئی اور دمہ تو ہے ہی دم کے ساتھ۔ اس وقت تک رگھو کا بیاہ ہو چکا تھا مگر کوئی مستقل روزگار آج تک نہیں جڑا۔ بڈھا گاؤں گیا تو کسی بہت سی چھوکریوں کے باپ نے ایک عدد اس کے سر منڈھ دی۔

بڈھا تو کسی کرم کا نہیں تھا۔ رگھو اور سوتیلی ماں بھوری بائی کا ٹانکہ جڑ گیا جس پر اس کی پتنی نے بڑے فیل مچائے۔ رگھو نے ہلکٹ کی مدد سے اسے مار کوٹ کر میکے پٹخ دیا کیوں کہ اس چڑیل نے بھی چھوکری تھوپ دی تھی۔

بڈھے کو جوان بیوی اور بیٹے کے تعلقات پر قطعی کوئی اعتراض نہ ہوتا اگر اس کی نوٹاک پابندی سے ملتی رہتی۔ مگر اتنا ٹھرا خریدنے کیلئے جو تینوں کو پورا پڑ جائے۔ بھوری تو ان دونوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی اور پانی کی طرح دارو ڈکار جاتی تھی۔ دارو کا توڑا پڑتا تو جوتم پیزار شروع ہو جاتی۔ رگھو جب بھوری کی ٹھکائی کرتا تو بڈھے کے دل میں کلیاں چٹخنے لگتیں۔ رقابت کا جذبہ تو کبھی کا مر چکا تھا کہ یہ نازک

احساس دھن کی چھاؤں میں ہی پھلتا پھولتا ہے۔ بوڑھے کی رگ رگ پھوڑا بن چکی تھی تب ہی رقابت کی آگ بھی سڑ گل کے رس گئی ہو گئی۔ اسے تو لیس لگن تھی اور وہ دارو کی کہ سب سے بڑا مرہم مدہوشی ہے۔

پتہ نہیں بڈھے کے خاندان کے فرد اقلیت کی فہرست میں آتے ہیں کہ نہیں۔ آدھا بمبئی تو اسی قبیلے کا نظر آتا ہے۔ جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ پچھلی دفعہ بڑا دند مچا تھا۔ بڈھے نے بھو اور رگھو کے ساتھ جا کر ووٹ بھی ڈالا تھا۔ تمام دیواریں گائے، بیل اور گھوڑے کی تصویروں سے بھر گئی تھیں۔ بڑی مشکل سے دو برساتوں میں دھلیں۔ اسے قطعی پتہ نہیں تھا کہ وہ ان کو ووٹ کیوں دے رہا ہے۔ اسے لاری میں لے جایا گیا اور اسے جو بتایا گیا تھا اسی تصویر پر نشان لگا دیا تھا۔ نیلی سیاہی کا نشان اس نے حسب ہدایت فوراً انگوٹھے سے رگڑ ڈالا تھا۔ اسے گنتی نہیں آتی اور نہ یادداشت کام کرتی ہے پر اس دن اس نے کتنے ہی پرچے ڈبوں میں ڈالے اور اس دن سب کو ملا کر پورے اڑتالیس روپے ہاتھ لگے تھے تب کی دن جی بھر کے ٹھرا اور بڑا گوشت اڑایا تھا---- پتہ نہیں کون گدی پر بیٹھا کون اترا' پرچیوں پر بنی تصویریں خاموش ہیں نہ دیواروں پر لگے اونٹ گھوڑے کی وہ زبان جانتا ہے جو اپنی مشکلات کا کسی سے حل پوچھے--- اور تب بھوری بائی کے دماغ آسمان پر چڑھنے لگے تھے۔ گھر کا خرچہ چلانے کیلئے وہ جھونپڑی والی بائی کی مدد سے دھندہ کرنے لگی تھی۔ وہیں اس کی ایک فلم والے سے بھینٹ ہو گئی۔ اور وہ اسے بھیڑ کے سین میں ایکسٹرا بنا کے لے گیا۔ اسی دن سے بھوری بائی اپنے کو فلم اسٹار سمجھنے لگی ہے اور دھرتی پر پیر نہیں ٹکتے۔

ادھر ڈھونڈی کی کمائی کی خیر خبر دور دور تک پھیل رہی تھی۔ آٹھ دس گھروں کا کام سمیٹتی ہے فی گھر تیس پینتیس مار لیتی ہے۔ پیر میں پازیب بھی جھنکتی ہے اور سود پر روپیہ بھی چلانے لگی ہے۔ تبھی رگھو ایک جان چھوڑ ہزار جان سے اس پر عاشق ہوا۔ مگر ڈھونڈی کے نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ ہلکٹ نے فیل مچائے کہ فلم والے نے اسے ہیروئن بنانے کا پکا وعدہ کیا ہے۔ رگھو کی بیوی جو میکے چلی گئی تھی

اس کا بھائی نہیں بھیجتا کہ وہاں نئی کالونی میں بہت کام ہے۔ جو مزدور دور دور کے گاؤں سے آکر جٹے ہیں وہ گھر والی تھوڑے سنگ لے کے آئے ہیں۔ ان کی بھی تو ضروریات ہیں۔ رگھو گیا بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر بھائی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی چھوکری مر گئی۔ اچھا ہوا اب اس کی گود میں چھ مہینے کا لونڈا ہے۔ رگھو کو تاؤ آتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کا سالا بہن کی کمائی کھا کھا کر سانڈ ہو رہا ہے۔

کمپاؤنڈ میں اب بھی جھگڑا چل رہا ہے۔

بڑی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے کہ ڈھونڈی پر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا بلکہ ڈھونڈی نے اپنے پتی کی ناک چبا ڈالی۔ تھوکی بھی نہیں شاید نگل گئی۔ پولیس رگھو کو لے گئی مگر ڈھونڈی ارتکاب جرم کے بعد سٹک گئی۔

رگھو بے ہوش ہے' شاید مر رہا ہے یا مر چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے ڈھونڈی اسی عمارت کے کسی فلیٹ میں انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہے مگر چوکی دار اندر سے تالا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ صبح سے پہلے نہیں کھولے گا۔ مجھے سخت بے چینی ہے۔ چھوکرے چوکی دار پر آوازے کس رہے ہیں' پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ صبح جب پولیس ڈھونڈی کی تلاش میں آئے گی تب دروازہ کھلے گا۔

مجھے ڈھونڈی سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے پتی کی ناک چبا ڈالی۔ میں نے آج تک ایسی بات نہیں سنی کہ کسی عورت نے غصہ یا رقابت میں پتی کی ناک کاٹی ہو۔ ہاں مردوں کی ناک تب ضرور کٹ جاتی ہے جب ان کی بہن بیوی یا بیٹی کسی کے سنگ بھاگ نکلیں یا حرام کا بچہ جن بیٹھیں' پر عورت ذات پر پتی کی ناک سچ مچ کاٹ ڈالنا بالکل نہیں سجتا۔

میں بڑی ترقی پسند بنتی ہوں۔ عورت اور مرد کی برابری کی شدت سے قائل ہوں۔ مگر ڈھونڈی کا ناک چبا ڈالنا بہت ویسا لگ رہا ہے۔ شاید اسلئے کہ دنیا کی تاریخ میں میرے علم کے حسابوں میں یہ پہلا حادثہ ہے۔

"ارے سالی چبا کے گٹ گئی' تھوکی بھی نہیں۔" نیچے منڈیر پر بیٹھا کوئی تبصرہ کر رہا ہے۔ "ہم نے بہت ڈھونڈی نہیں ملی شاید کسی کی چپل میں چپکی چلی گئی۔"

اس کا بھائی نہیں بھیجتا کہ وہاں نئی کالونی میں بہت کام ہے۔ جو مزدور دور دور کے گاؤں سے آکر جٹے ہیں وہ گھروالی تھوڑے سنگ لے کے آئے ہیں۔ ان کی بھی تو ضروریات ہیں۔ رگھو گیا بہت ہاتھ پیر جوڑے مگر بھائی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی چھوکری مر گئی۔ اچھا ہوا اب اس کی گود میں چھ مہینے کا لونڈا ہے۔ رگھو کو تاؤ آتا ہے اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کا سالا بہن کی کمائی کھا کھا کر سانڈ ہو رہا ہے۔

کمپاؤنڈ میں اب بھی جھگڑا چل رہا ہے۔

بڑی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے کہ ڈھونڈی پر کسی نے قاتلانہ حملہ نہیں کیا بلکہ ڈھونڈی نے اپنے پتی کی ناک چبا ڈالی۔ تھوکی بھی نہیں شاید نگل گئی۔ پولیس رگھو کو لے گئی مگر ڈھونڈی ارتکاب جرم کے بعد سٹک گئی۔

رگھو بے ہوش ہے' شاید مر رہا ہے یا مر چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے ڈھونڈی اسی عمارت کے کسی فلیٹ میں انڈر گراؤنڈ ہو گئی ہے مگر چوکی دار اندر سے تالا مار کر بیٹھ گیا ہے۔ صبح سے پہلے نہیں کھولے گا۔ مجھے سخت بے چینی ہے۔ چھوکرے چوکی دار پر آوازے کس رہے ہیں' پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ صبح جب پولیس ڈھونڈی کی تلاش میں آئے گی تب دروازہ کھلے گا۔

مجھے ڈھونڈی سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے پتی کی ناک چبا ڈالی۔ میں نے آج تک ایسی بات نہیں سنی کہ کسی عورت نے غصہ یا رقابت میں پتی کی ناک کاٹی ہو۔ ہاں مردوں کی ناک تب ضرور کٹ جاتی ہے جب ان کی بہن بیوی یا بیٹی کسی کے سنگ بھاگ نکلیں یا حرام کا بچہ جن بیٹھیں' پر عورت ذات پر پتی کی ناک سچ مچ کاٹ ڈالنا بالکل نہیں سجتا۔

میں بڑی ترقی پسند بنتی ہوں۔ عورت اور مرد کی برابری کی شدت سے قائل ہوں۔ مگر ڈھونڈی کا ناک چبا ڈالنا بہت ویسا لگ رہا ہے۔ شاید اسلئے کہ دنیا کی تاریخ میں میرے علم کے حسابوں میں یہ پہلا حادثہ ہے۔

"ارے سالی چبا کے گٹ گئی' تھوکی بھی نہیں۔" نیچے منڈیر پر بیٹھا کوئی تبصرہ کر رہا ہے۔ "ہم نے بہت ڈھونڈی نہیں ملی شاید کسی کی چپل میں چپکی چلی گئی۔"

اس کی ناک دیکھ رہے تھے۔

رگھو کی ناک پر ٹانکوں تک کا نشانہ نہیں تھا۔ معجزہ ہو گیا' ضرور ڈھولکیا نے کیس ہینڈل کیا ہو گا۔ بھئی کمال ہے نہ پھایا نہ پٹی۔ یہاں تک کہ کھرونچ تک نہیں۔ لوگ گم سم اس کی ناک کو تک رہے ہیں اور رگھو سب کی اور مشتبہ نظروں سے دیکھتا لپکا چلا آ رہا ہے۔

"کون بولا ناک کاٹا۔" رگھو بگڑ کھڑا ہوا۔ جب جاستی پتیا تو ناک سے کھون آتا۔ پھر اس ہلکٹ نے ہم کو ٹکر مارا۔ تبھی ہم بے ہوش ہو گیا۔"

ایک دم ڈھونڈی چنگھاڑ چنگھاڑ کر رونے لگی اور سرپٹ مراٹھی میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔

بالکنیوں سے صاحب لوگ جھک جھک کر نہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ سب ایک دم بول رہے تھے اور کسی کو دوسرے کی بات سمجھنے کی فرصت نہ تھی۔ اور کچھ سمجھنے کی بات بھی نہ تھی۔ سب ہی کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔ رگھو جلدی جلدی ڈھونڈی کا گوڈر سمیٹ رہا تھا۔۔۔۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد مجمع کچھ مایوس سا ہو کر بکھر گیا۔ اتنے دھانسو ڈرامے کا انجام اتنا پھس پھسا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی میں رگھو کی ناک اور ڈھونڈی کے منہ سے خون ابلتا دیکھ کر کسی منچلے نے پولیس کو فون کر دیا۔

ہسپتال کے ڈاکٹر بھی بے حد خفا تھے کہ نکسیر کے کیس کیلئے ان کی نیند حرام کی۔ پولیس شرمندہ تھی کہ غنڈوں نے جان بوجھ کر بے وقوف بنا دیا۔

خود میرے اوپر سخت کھسیان پن طاری تھا۔ جس کا الزام میں کسی نہ کسی پر تھوپنے کے منصوبے بنا رہی تھی۔ میں جو خود کو نہایت روشن خیال دکھی طبقہ کا ہم درد اور عام انسان سے بے حد قریب سمجھتی ہوں' ان کے بارے میں بس اتنا جانتی ہوں کہ نکسیر کو قتل کی واردات یقین کر لیتی ہوں۔ مرد و عورت کے برابر حقوق کی علم بردار مرد ناک کاٹتا ہے تو نفرت کرتی ہوں مگر عورت مرد کی ناک کاٹے تو دہل جاتی ہوں۔ اف کتنی شرم کی بات ہے۔
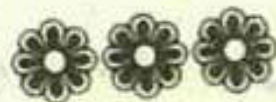
عصمت چغتائی سے چند سوال

ترقی پسند ادب کیا ہے؟

ایسا ادب جو انسان کی ترقی چاہے انسان کی بھلائی چاہے۔ وہ ادب وہ آرٹ جو انسان کو پیچھے نہ دھکیلے۔ انسان کو دنیا کی اچھی سمت چلائے۔ وہ ادب جو انسان کو علم و صحت اور کلچر حاصل کرنے میں مدد دے اور جو ہر انسان کو برابر کا حق دینے پر یقین رکھتا ہو۔ انسان کی زندگی کے عروج کا قائل ہو۔ انسان کو گندگی سے نکال کر صاف و شفاف مقام پر پہنچادے۔ مکمل طور پر انسان کی بھلائی چاہے۔ اس کے سوچنے کے انداز پر ایسا اثر ڈالے کہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے بڑھے۔ اندھیرے میں جانے کے بجائے اجالے میں آئے۔ وہ ادب ترقی پسند ادب ہے۔

جب ہم ترقی پسند ادب کہتے ہیں تو ان کی وسعت لامحدود ہے۔ قصہ و کہانی، ناول، نظم اور غزل غرضیکہ ہر فکر و عمل کے کارہائے نمایاں جن سے انسان کی فلاح و بہبود مقصود ہو وہی دراصل ترقی پسند ادب ہے۔ اندھیرے سے اجالے کی طرف جو ادب لائے اس کو ترقی پسند ادب کہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب آج پیدا نہیں ہوا بلکہ آج کل کے لکھنے والوں سے پیشتر سے ترقی پسند ادب لکھا جا رہا ہے۔ موجودہ دور کے بہت سے شعراء پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، یعنی اس وقت سے ترقی پسند ادب لکھا جا رہا ہے، اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔

کبیر کو مانتے ہیں کہ وہ ترقی پسند تھے۔ اقبال کو ترقی پسند مانتے ہیں حالانکہ اس

وقت یہ لفظ وجود میں بھی نہ آیا تھا۔ غالب کو مانتے ہیں کہ وہ ترقی پسند تھے۔ انہوں نے انسان کی بہتری پر زور دیا ہے۔ اپنے زمانے میں میراں نے نیا قدم اٹھا کر عورت کی ہستی کو ابھارا تھا۔ عورت کے حقوق کو ابھارا تھا۔ عورت بھی اپنا خدا حاصل کر سکتی۔ اس کا خدا اس کا پتی نہیں ہے۔ اس کا شوہر ہی اس کا خدا نہیں ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے خدا تک براہ راست پہنچ سکتی ہے۔ میراں نے خدا سے رشتہ جوڑ لیا اور کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

نئی نسل کا مستقبل کیا ہے؟

ہم اپنے بچے کو پیدا ہوتے ہی بتاتے ہیں کہ وہ پیسہ کمانے کی مشین ہے۔ اسے صرف پیسہ کمانا ہے اور خصوصاً" لڑکے کے لئے یہ ضروری ہے۔ لڑکیوں کی شادی کرنا ہے۔ لیکن اب لڑکی کے دل میں بھی ڈال رہے ہیں کہ تجھے بھی پیسہ کمانا ہے۔ پیسہ کما۔ کسی طرح سے کما۔ کہیں سے کما۔ ظاہر ہے کہ مشرق سے زیادہ مغرب میں پیسہ کمانے کے مواقع زیادہ ہیں۔ اس وقت لڑکا مغرب کی طرف جا رہا ہے۔ وہ مغرب کی محبت میں نہیں جا رہا ہے، وہ مغرب کی تہذیب کی محبت میں نہیں جا رہا ہے، مغرب میں جو اسے دولت ملتی ہے وہ اس کے لالچ میں جا رہا ہے۔ مغرب میں رہتا ہے، مغرب میں رہنا فخر سمجھتا ہے، مغرب کی نقل کرنا فخر سمجھتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا ہے۔ بڑا سا بنگلہ خریدو، موٹر خریدو اور دنیا کی آسائش خریدو مغرب کی نقل کرو، یہ تو ہم بچہ کو پیدا ہوتے ہی سکھا دیتے ہیں کہ وہ مغرب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے ہم اس کے لئے بچپن میں کاؤبوائے کا لباس خریدتے ہیں۔ اس کو انگریزی لباس پہناتے ہیں۔ بچی کو فراک پہناتے ہیں ہم اسے پینٹ پہناتے ہیں۔ وہ بچہ کیوں نہ مغرب کے رنگ میں رنگا رنگ ہو۔ پھر ہم شکایت کرتے ہیں کہ مغرب کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ ہم بچپن سے بچے کو مغرب کی طرف دھکیلتے ہیں اور مغرب کی چیزیں اس کو لا کر دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہمارے یہاں اتنی کتابیں بچوں کے لئے نہیں ہیں، اسے شروع ہی سے انگریزی کتابیں دی جاتی ہیں۔ اسے اے بی سی پڑھائی جاتی ہے۔

کھلونے انگریزی طرز کے دیئے جاتے ہیں۔ ہماری گڑیا انگریزی شکل کی ہوتی ہے اور فخر سمجھا جاتا ہے کہ ہم باہر سے لا کر گڑیا بچہ کو دیں سکیں ہر چیز تو ہم باہر سے لا کر دیتے ہیں اور باہر کی ہر چیز اس کے ذہن میں بچپن سے بٹھاتے ہیں۔ اور اب جب وہ مغرب کی پوجا کرنے لگتا ہے تو ہم شکایت کس طرح کر سکتے ہیں۔ ہم اسے مغرب کی پوجا سکھاتے ہیں اور مغرب کی پوجا ہم اس لئے کرتے ہیں کہ وہاں دولت ہے' وہاں صنعتکاری ہے۔ صنعت کاری دولت لاتی ہے۔ یہ دولت کی ہوس ہے جو ہمارے دلوں میں مشرقی تہذیب کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے اور مغرب کی تہذیب کو اپنانے کی دعوت دیتی ہے۔ ہمارا کلچر کیا ہے...؟ ہمارا کلچر آج کی زندگی میں بے کار ہے۔ ہمارا کلچر مٹتا جا رہا ہے۔ اب کہاں چاندنی اور قالین بچھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نہ وہ گاؤ تکیے ہیں اور نہ وہ مسند ہے اور نہ وہ تخت ہیں اور نہ وہ مسند ہے اور نہ وہ تخت ہیں۔ اب سب صوفہ سیٹ پر بیٹھتے ہیں۔ دستر خوان غائب ہو گیا۔ اب کھانے کے لئے کھانے کی خصوصی میز اور کرسیاں ہیں۔ ہم اپنے بچے کو مغرب کی نقل کرنے کے لئے ہی پالتے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا شکایت ہے' وہ مغرب کی اچھائیاں بھی لیتا ہے۔ ہم اسے مغرب کی طرف بھیجتے ہیں۔ فخر سمجھتے ہیں کہ وہ وہاں سے ڈگری لائے۔ بچہ کا کوئی قصور نہیں ہے' نوجوانوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر وہ دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ان سے کہا جا سکتا کہ مشرقی تہذیب کی طرف دھیان دو۔ ہمارا تہذیب ہے کہاں؟ کتنے ماں باپ جو اپنے بچوں کو اپنی تہذیب و تمدن کی تعلیم دیتے ہیں' کتنے والدین ہیں جو اپنے بچوں کو موہنجوداڑو دکھانے لے جاتے ہیں۔ کتنے ماں باپ ہیں جو اپنے بچوں کو عجائب گھر لے جا کر انہیں اپنے ملک کے آثار قدیمہ سے روشناس کراتے ہیں۔ سب مغربی رہائش اور طرز گفتگو کی نقل کرتے ہیں۔ آج بھی ہمارا طریقہ تعلیم مغربی ہے۔ آپ ہی دیکھئے کہ انگریز چلا گیا' لیکن انگریزی اب بھی ہماری زندگی کا سہارا ہے۔ نوکری انگریزی سے ملتی ہے۔ انگریزی تعلیم سے ملتی ہے۔ ہندی اور اُردو صف دوم پر ہے۔ غریب آدمی کو ہندی پڑھاتے ہیں تاکہ وہ محدود دائرے میں گھومتا رہے اور جنہیں حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے وہ مغربی تعلیم حاصل کرتے ہیں' مغربی تعلیم سے حکومت کی جاتی ہے۔ حاکم

بننے کے بعد دولت جمع کی جا سکتی ہے۔ ہمارا ذریعہ تعلیم مغربی ہے۔ جب ہم اپنے ملک میں رہتے ہوئے مغربی انداز فکر رکھتے ہیں اور اس پر عمل کر رہے ہیں تو پھر کس طرح بچوں اور جوانوں کو مغربی تہذیب کے اثر سے دور رکھ سکتے ہیں۔ جب ہم نے اپنی تہذیب کو خیرباد کہہ دیا تو پھر ہم کس منصب سے اپنے بچوں سے کہیں کہ مغرب سے دور بھاگو اس لئے کہ مغرب اور اس کی باتیں ہمارے گھرانوں میں داخل ہو چکی ہیں جس کو ہم گھر سے باہر نہیں نکال سکتے یا نکالنا نہیں چاہتے۔ اسے ملک بدر تو کیا شہر بدر بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے سفید فام اقوام سے آزادی حاصل کی مگر ہم آج بھی معاشی طور پر مغربی اقوام کے ہیں۔ مغربی اقوام خوشحال اور دولت مند بن کر ترقی پذیر ملکوں کو غریب سے غریب تر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اب اہمیت اس امر کی ہے کہ ہم خود اعتمادی پیدا کریں۔ اور خود اعتمادی ترقی پسند ادب ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ہمارے ادیبوں نے عوام کی بہتری کے لئے اپنے قلم کو استعمال نہ کیا تو ہمیں افسوس ہوگا اس لئے کہ جو ادیب، صحافی اور مفکر حالات حاضرہ سے منہ موڑ کر محض ذاتی اغراض کی خاطر مضامین لکھیں گے۔ ان میں کوئی جان نہ ہوگی اور بے جان شے بے معنی ہوتی ہے۔

رپورتاژ

یہاں سے وہاں تک

کراچی ائرپورٹ پر جیسے ہی میں نے ہوائی جہاز کی سیڑھی سے نیچے قدم رکھا مجھے نہ جانے کیوں بے وجہ ہنسی آگئی اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جیسے پاکستان کی سرزمین نے مجھے اٹھ کر گلے لگا لیا ہو۔ لاؤنج کے دروازے پر مدحت سعید میرے بھائی عظیم بیگ کی لڑکی کھڑی تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس بعد دیکھا تھا۔ کتنی بدل گئی تھی۔ مگر میں نے اسے پہچان لیا۔ ہم دونوں مل کر خوشی کے آنسو بہانے لگے۔

کاؤنٹر پر ایک صاحب نے میرا پاسپورٹ اور ویزا مانگا۔ بڑے غور سے دیکھا پھر پاس بیٹھے ہوئے صاحب سے کچھ چپکے سے کہا اور مجھ سے پوچھا۔

"آپ عصمت چغتائی ہیں؟"

"پاسپورٹ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"خوش آمدید۔" مسکرا کر بولے میں نے شکریہ ادا کیا۔ مجھے باہر جانے کی جلدی تھی کیونکہ وہاں میرے عزیز میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اپنا بٹوہ ان صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ اور کہا مجھے باہر جانے دیجئے۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی اور میں باہر جا کر اٹھائیس برس کے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ٹوٹ کر ملی، بھائی، بھاوج بھانجے، بھتیجے، نواسے اور پوتے وہ جو یہاں سے جانے کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

بمبئی اور کراچی کے درمیان ایک گھنٹہ چالیس منٹ کا فاصلہ ہے۔ مگر اٹھائیس برس کے بعد میں نے انہیں دیکھا جن کے ساتھ ایک ماں کی گود میں جنم لیا تھا۔ ایک

ساتھ ہنس کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ یا خدا کتنا فاصلہ پیدا ہو گیا ان اٹھائیس برسوں میں۔ مدحت کے گھر پہنچی تو اور رشتہ دار وہاں موجود تھے۔ بار بار ایسا لگ رہا تھا خواب دیکھ رہی ہوں۔ کوئی دم میں جاگ جاؤں گی اور پھر وہی لامتناہی دوریاں آڑے آجائیں گی۔ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خدیجہ' زاہد عمر کی بہن کا فون آیا کہ اس کی بیٹی زیبا کے ہاں کھچڑے کی دعوت ہے اگر میں تھکی ہوئی نہیں تو آجاؤں فیض بھی آ رہے ہیں۔ فیض کا نام سن کر ساری تھکن غائب ہو گئی۔ وہاں فیض کو دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ جب بمبئی آئے تھے تو میرے پاس ٹھہرے تھے۔ کیا کیا محفلیں جمی تھیں۔ ہم دونوں بے اختیار بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔

"ہندوستان اور پاکستان گلے مل رہے ہیں۔" سب کہنے لگے۔

فیض سگریٹ پھونکتے رہے اور اپنے اشعار سناتے رہے موسیقی کی محفل درہم برہم ہو گئی۔ بیچ بیچ میں پوچھتے جاتے۔

"کرشن کیسے ہیں؟" سردار کیا کر رہے ہیں؟ بیدی نے کوئی نئی فلم بنائی؟ کیفی کا کیا حال ہے؟ ساحر پاکستان کیوں نہیں آتے؟؟"

"دروازوں سے ہم سب لگے کھڑے ہیں ذرا کنڈی تو کھولئے۔" میں نے کہا۔

"ہاں روزن و در کھلنا چاہئیں۔" فیض نے جواب دیا۔

دو بجے محفل ختم ہوئی۔

صبح دس بجے چار پانچ آدمی ملنے آ گئے۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ چار پانچ اور۔ اور پھر وسیع ڈرائنگ روم بھر گیا۔ معلوم ہوا وہ صاحب جو ائرپورٹ پر پاسپورٹ دیکھ کر کھسر پھسر کر رہے تھے انہوں نے لوگوں کو ٹیلی فون کر دیئے اور اخباروں میں موٹے موٹے حرفوں میں میرے کراچی پہنچنے کی خبر شائع ہو گئی۔ دعوت نامے برسنے لگے لوگ برابر آتے رہے۔ رسالوں کے ایڈیٹر' جرنلسٹ' کالم نویس سوالوں کی بوچھاڑ کرتے۔ برسوں کے صبروں کے پیالے چھلک رہے تھے۔

ایک سوال مجھ سے اتنی بار کیا گیا کہ میں تنگ آ گئی۔ کرشن کیسے ہیں؟ کرشن کے مداحوں کا کوئی حساب نہیں۔ میں جہاں بھی گئی سب نے کرشن کو بار بار پوچھا۔ پھر تو میں

نے یہ کرنا شروع کر دیا کہ ہر جلسے میں سب سے پہلے کرشن چندر کے بارے میں تفصیل سے خبر رسانی کے فرائض انجام دیتی پھر کوئی دوسری بات کرتی۔ دوسری شخصیت جس کے بارے میں لوگ بہت جٹ کر سوال کرتے ہیں وہ عینی ہیں۔ میں نے ان کے نئے ناول کے چھپنے کی خوش خبری پہنچا دی اور سب کو بڑا انتظار ہے۔

دروازے بند ہو جاتے سے جستجو اور بڑھ گئی ہے۔ علم و ادب سے شوق رکھنے والے اپنے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ یہاں ملکوں کی سرحدیں مجبور اور بے بس نظر آتی ہیں۔ بلکہ دوری نے اور شوق کی آگ کو بھڑکا دیا ہے۔ انسان سے جو چیز چھینی جائے اسی کی طرف لپکتا ہے۔ سارے پروپیگنڈے پست پڑ جاتے ہیں۔

اپنے پہنچنے کے دوسرے دن میں نے سوچا شاہد لطیف کے رشتہ داروں کو فون کروں کہ نہ کروں۔ ان کے بعد سے رشتہ ختم سا ہو گیا۔ پھر بھی دل نہ مانا اور میں نے ٹیلی فون ڈائری میں گھنٹوں ڈھونڈا نمبر معلوم کر کے شاہد لطیف اور شمشاد اشرف کو فون کیا۔ یہ دونوں شاہد کے بڑے بھائی کے داماد اور بھتیجے ہوتے ہیں۔ دونوں آئے اور مجھے اسی دم یقین ہو گیا کہ انسان نہ توڑنا چاہے تو دنیا کا کوئی رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ شاہد کے بھائی عظمت اللہ خان بھی آئے۔ کوئی نہیں بدلا ان اٹھائیس برسوں میں ایک دن بھی تو نہیں بدلا۔ سب قریبی رشتہ داروں کی طرح خاطریں کرتے ہیں۔ مدحت اور خالد لطیف نے دونوں ہاتھوں سے مجھے سمیٹ لیا۔ میرا ہر پروگرام ان کے ہاتھ میں تھا۔ صبح کہاں میٹنگ ہے دوپہر کو لنچ کس کے ہاں ہے شام کو کہاں چائے پینی ہے اور رات کا کھانا کس کے ہاں ہو گا۔ ٹیلی فون چلے آرہے ہیں۔ پاکستان والوں کو کھانے اور چائے پر چائے پلانے کا جنون ہے۔ اگر میں سب دعوتیں قبول کرنے کی سکت رکھتی تو کم سے کم چھ مہینے چاہئے تھے۔ ایک مہینے کا ویزا لے کر گئی تھی۔ ایک مہینے کا اور بڑھوا لیا۔ پھر بھی بہت سوں کو شکایت رہ گئی۔ کوئی میٹنگ ایسی نہ تھی جس میں کھانے پینے کا شغل نہ ہو۔ اور کوئی دعوت ایسی نہ تھی جس میں میٹنگ کا سماں نہ بندھ جاتا ہو۔ بس سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی۔ سب سے پہلا سوال تو یہ کہ "ترقی پسند ادب نے ہندوستان میں دم

توڑ دیا۔"

میں کہتی یہ جملہ تو اب بہت سڑ گیا ہے پچھلے تیس برس سے یہی سن رہی ہوں کہ ترقی پسند ادب کی میت اٹھ گئی لیکن آج جو میں ہزاروں میل دور سے زندگی میں پہلی بار آپ کے ہاں آئی ہوں تو آپ مجھے ترقی پسند بھی کہتے ہیں اور دوسرے ترقی پسندوں کی خیریت بار بار پوچھتے ہیں اگر ترقی پسند ادب زندہ نہ ہوتا تو آج آپ اتنی بڑی تعداد میں یہ پوچھنے جمع نہ ہوتے---- کہ کرشن چندر کی صحت اب کیسی ہے؟ ادب کو ادیب نہیں پڑھنے والے زندہ رکھتے ہیں۔ جب تک پڑھنے والے زندہ رہیں گے ادب نہیں مرے گا۔ دوسرا سوال جو ہر میٹنگ میں بار بار اٹھایا جاتا تھا وہ تھا "کیا اردو کو ہندوستان میں بالکل ختم کر دیا گیا؟" "کیا اردو رسم الخط ختم ہو رہا ہے؟"

میں کہتی اردو رسم الخط ہندوستان میں ختم ہو رہا ہے لیکن اسے زندہ رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اردو اکیڈمی کی شاخیں پھیل رہی ہیں جو اردو کی بقا کے لئے بہت جاں فشانی سے جٹی ہوئی ہے۔ ایوارڈ دیئے جا رہے ہیں ادیبوں کو کتابیں چھپوانے کے لئے مدد دی جا رہی ہے۔ اردو کی لائبریریوں کو عطیے دیئے جا رہے ہیں۔ "ویسے اردو زبان پورے ہندوستان میں تھوڑی بہت سمجھی جاتی ہے۔ فلمیں اردو میں بنتی ہیں، ہندی میں نہیں۔ غزلوں اور قوالوں کی محفلیں بہت پسند کی جاتی ہیں۔ آزادی سے پہلے اتنی نہ کی جاتی ہوں گی۔ جتنی اب کی جاتی ہیں۔ مشاعرے سارے ملک میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر سچ پوچھئے تو اردو ہندوستان کی غیر سرکاری مادری زبان بنتی جا رہی ہے۔ عام بات چیت میں کوئی ہندی نہیں بولتا۔ اب بھی ہندوستان میں پاکستان سے زیادہ آبادی اردو سمجھتی اور بولتی ہے۔"

مگر جرنلسٹ بڑی خوبصورتی سے ادھوری بات کو اخباروں کی سرخیاں بناتے ہیں سب اخباروں میں میں نے جو سوال دہرایا تھا۔ اسی کو میرا بیان بنا کر چھاپ دیا۔ میں نے تشریح چاہی کہ آپ نے میرا پورا بیان کیوں نہیں چھاپا تو بغلیں جھانکنے لگے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یہ سن کر خوشی ہوتی کہ ہندوستان میں اردو کی حالت خراب ہے۔ اس طرح پاکستان کے قیام کو تقویت ملتی ہے۔

میں نے پوچھا کراچی والوں نے بھی تو "اردو خطرے میں" نعرہ لگایا تھا۔ بہت اودھم مچی تھی جس کے گواہ شہیدوں کے مزار ہیں۔ اس کا جواب بھی ٹال جاتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو سوچتے ہیں اردو جہاں بھی پھلے پھولے پاکستان خوش ہوتا ہے کہ اس طرح ہمارا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اردو ادب جہاں بھی پیدا ہوتا ہے ہم اسے اپنا سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں جو کچھ اردو میں چھپتا ہے وہ پاکستان کہیں نہ کہیں سے حاصل کرکے اردو ادب میں شامل کرلیتا ہے۔ لیکن ہندی ادب کو جو اردو سے بہت دور نہیں شامل کرنے کا ابھی کسی کو خیال نہیں آیا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہاں شاید ہی کوئی اتنی ہندی جانتا ہو کہ اردو میں منتقل کرسکے۔ ویسے ہندی کے الفاظ نئے شعراء میں بہت مقبول ہیں۔ ان کا استعمال دن بدن بڑھ رہا ہے۔ جس پر بعض نک چڑھے معترض ہوتے ہیں۔ لیکن جمیل الدین عالی جو خالص پاکستانی ہیں اور پائے کے ادیب اور شاعر ہیں ہندی کے الفاظ بہت استعمال کرتے ہیں۔ اردو میں ہندی کے استعمال سے بڑی خوبصورتی پیدا کردی ہے اور زبان کو وسعت ملی ہے۔ ان ہندی الفاظ کو بڑی جاں فشانی سے چنا گیا ہے۔ سردر بارہ بنکوی کی نظم "ادم پر بھو شانتی" ہندی میں ہے اور اس قدر لطیف اور نرم ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ ایک بھی ثقیل اور بوجھل لفظ نہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو ان کی اس حرکت کو پاکستان اور اردو سے غداری کا لقب دیتے ہیں۔ جب خسرو نے فارسی میں ہندی کے الفاظ ٹانکے تو وہ کلاسیکی ادب بن گئے۔ ان پر کسی نے فارسی کے ساتھ غداری کرنے کا الزام نہ لگایا۔

سرسید زنانہ کالج میں ٹیچروں اور طالبات کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لڑکیوں کو تعلیم کا بہت شوق ہے۔ خاص طور پر سائنس پر بہت زور دے رہی ہیں۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں سائنس کی طرف جھکتی ہیں عموماً لڑکیوں کو ہوم سائنس کھانے پکانے سینے پرونے کے کورس سے دلچسپی ہوتی ہے لیکن پاکستان کی زیادہ تر لڑکیاں ڈاکٹر اور انجینئر بننا چاہتی ہیں۔ شادی کے بعد کام کرنا اچھا ہی نہیں ضروری سمجھتی ہیں۔ زیادہ تر لڑکیاں وہ ہیں جن کی مائیں برقع اوڑھتی تھیں اور تعلیم سے بے بہرہ تھیں۔ ان کی یہ پہلی کھیپ ہے جو اعلیٰ تعلیم پر مصر ہے۔

لڑکیاں وہاں مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ ہندوستان کے لئے تو یہ عام بات ہے لیکن پاکستان میں یہ بڑی قابل تعریف بات ہے۔ میری چند لڑکیوں سے گفتگو ہوئی جو اخباروں میں کام کرتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ایسی لڑکیوں پر بڑے رکیک حملے کرتے ہیں۔ وہاں بازار میں کوئی اکیلی لڑکی نہیں گھوم پھر سکتی۔ ٹیکسی میں نہیں جا سکتی۔ بس میں لوگ بدتمیزیاں کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں دلیری سے کام پر ڈٹے رہنا قابل ستائش ہے۔

بہت لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اگر عورتیں کام کریں گی تو ان کے بال بچے ویران ہو جائیں گے۔ گھر تباہ ہو جائیں گے۔ شوہر کہتے ہیں وہ دفتر سے تھکے ہوئے آتے ہیں، تو گھر میں ترو تازہ بیوی چاہتے ہیں۔ کم ہی ایسے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں جو اپنی بیوی کے کام کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر پاکستان میں ایسے لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جو بڑے بوسیدہ ماحول سے نکل کر آئے ہیں اور اپنی بیویوں کو کام کرنے دیتے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ شوہروں کی اچھی آمدنی ہے پھر بھی عورتیں کام کرتی ہیں۔ ساتھ ساتھ ڈگریاں بھی لیتی جاتی ہیں۔ نوکروں کی وہاں بڑی قلت ہے، گھر بڑے کشادہ ہیں۔ بیویاں سب اچھی طرح کام پر جتی رہتی ہیں جبکہ ان کی مائیں پلنگ کے بان توڑا کرتی ہوں گی۔

لیکن ان کے مرد انگریزوں کی طرح ان کی گھر داری میں مدد نہیں کرتے۔ بالکل ہمارے ملک کے مردوں کی طرح دفتر سے آ کر بھی مرد بنے رہتے ہیں۔ خیر یہ کیا کم ہے کہ انہیں اور ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔

ینگ رائٹرس کی میٹنگ بڑی دلچسپ رہی۔ وہاں ممتاز حسین سے ملاقات ہوئی۔ بڑا مجمع تھا۔ غالب لائبریری کا احاطہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ کچھ لوگ دیوار کے اس پار فٹ پاتھ پر جمع تھے۔ نوجوانوں نے مضمون پڑھے۔ جب میرے بولنے کی باری آئی تو بجلی خراب ہو گئی۔ میں نے سوچا چلو جان چھوٹی مجھے بولنے میں سخت تکلیف ہوا کرتی ہے۔ بجلی پون گھنٹے غائب رہی لوگ بیٹھے رہے اور میں آٹو گراف بک پر اندھیرے میں انکل سے دستخط کرتی رہی۔ خدا خدا کر کے بجلی آئی۔ کچھ ایسا مجمع تھا کہ میرا سارا تکلف

غائب ہو گیا۔ بزرگ نہیں تھے زیادہ تر نوجوان تھے ان سے باتیں ہی تو کرنا تھیں لکچر تو نہیں دینا تھا۔

اور میں بے تکلفی سے باتیں کرنے سے کہاں تھکتی ہوں۔ سب سے پہلے تو میں نے ہندوستان کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، فن کاروں اور عوام کی طرف سے پاکستان والوں کو بہت بہت پیار دعا اور سلام پہنچایا۔ اس پر بڑے زور سے اور دیر تک تالیاں بجیں اور جب میں نے یہ کہا کہ دروازے کھل جائیں لتا اور مہدی حسن ڈوئٹ گائیں اور نور جہاں اور محمد رفیع ساتھ گائیں تو میں تو ہندوستان اور پاکستان جھوم اٹھیں۔ ہم سب ادیب اور شاعر بیٹھیں سر جوڑ کر کوئی راہیں تلاش کریں کہ ہمارے دونوں ملک آپس کی دوستی بڑھائیں۔ ادب کا تبادلہ ہو۔ دونوں ملکوں کا بچہ بچہ ہتھیار بند ہو اور وہ ہتھیار علم، صحت اور خوش حالی کے ہوں۔ میں نے سردار جعفری کی نظم "صبح فردا" کا حوالہ بھی دیا اور مجمع خوشی سے جھوم اٹھا۔ عوام کسی ملک کے ہوں گھٹن سے عاجز آجاتے ہیں۔ ہم خواہ جسمانی طور پر کتنی دور ہوں دلوں میں تو ایک دوسرے کے لئے بے انتہا جگہ ہے۔

1976
۲۹ ستمبر ۷۶ء کو پریس کلب نے مدعو کیا۔ کلب کے صدر ہمدان امجد علی نے ایک مضمون پڑھا جسے میں کھسیانی صورت بنائے سنتی رہی۔ پھر یہ سوچ کر دل کو سمجھالیا کہ یہ میرے لئے نہیں اس قلم کے بارے میں کہہ رہے ہیں جو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ اے پی پی کے مختار زریں نے ایک پھڑکتا ہوا مضمون پڑھا جس کا ہر جملہ چنگاری کی طرح چٹختا رہا۔" میں ہر شخص کو پلیٹ میں لے لیتی ہوں پھر جب کوئی میرے اوپر چھری پھیرتا ہے تو مجھے بڑا سکون ملتا ہے جیسے میرے گناہوں کی تلافی ہو رہی ہو۔" اس جلسہ میں بہت سے کراچی کے صحافیوں اور اہل قلم سے ملاقات ہوئی۔

دوسرے دن صبح ریڈیو پاکستان کی ٹرانسکرپشن سروس نے کوئی سوا گھنٹہ کا انٹرویو لیا۔ بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ہر موضوع کو اس گفتگو میں نچوڑ لیا۔ سوا گھنٹہ پر لگا کر اڑ گیا۔

شام کو پاکستان آرٹس کونسل نے "اخبار خواتین" کے تعاون سے ایک استقبالیہ

تھا مگر بیچ کا وقفہ بھی خالی نہیں گیا۔ ایک صاحب نہایت پریشان صورت دھول میں اٹے ہوئے آئے۔

"میں چودہ میل سے سائیکل پر آیا ہوں کئی گھنٹہ سے گھر تلاش کر رہا ہوں۔"

"بیٹھیے، کچھ ٹھنڈا منگواؤں۔"

"نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ نہیں نہیں کرتے رہے مگر مدحت بھاگ کر شربت روح افزا لے آئی۔ ایک دم غٹ غٹا کر پی گئے۔

"اور؟"

"پانی ہی منگوا دیجئے۔" وہ کچھ نادم ہو کر بولے۔ مگر مدحت لپک کر دوسرا گلاس بنا لائی۔ اور گم صم بیٹھے رہے پھر بولے کرشن چندر کیسے ہیں؟"

میں نے کرشن چندر کی بیماری پھر روبہ صحت ہونے کا حال سنایا۔ سنتے ہی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ بولے "چلتا ہوں۔" جھک کر میرے پاؤں چھو کر ہاتھ ماتھے سے لگایا اور ایک سپاٹے میں باہر نکل گئے۔ ہم لوگ ہکا بکا ایک دوسرے کی صورت تکنے لگے۔ نام بھی تو پوچھنے کی مہلت نہ دی کہ کرشن کو بتاتی تمہارا کوئی دیوانہ تمہاری خیریت لے کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔ کون تھا، خدا جانے!

آرٹس کونسل کا جلسہ دلچسپ رہا۔ شمیم اختر نے بڑے خلوص سے خوش آمدید کہا۔ مشہور سائنس دان ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، رئیس امروہوی اور حقی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شان الحق حقی کو نہ جانے کتنی صدیوں پہلے دہلی میں دیکھا تھا۔ جب ان کی بیوی سلمیٰ نہایت بھولی پھول کی طرح نازک تھیں۔ کون پہچان سکتا ہے۔ عزیزوں سے ملتی ہوں، ایسا لگتا ہے کہیں دیکھا ہے شاید۔ کسی جنم میں۔ میرے کتنے ڈھیر سارے اپنے ہیں جو پاکستان کے قیام کے بعد پیدا ہوئے۔ میرے اور ان کے درمیان کیسی کیسی دوریاں ہیں۔

انجم اعظمی، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر اور انجم رومانی نے اپنا کلام سنایا۔ پاکستان کے نوجوان شعراء کے کلام میں بڑی جان ہے۔ وہ لوگ وقت سے وابستہ ہیں

زندگی سے قریب اور اپنے مسائل سے آشنا۔ یکم اکتوبر کو پھر ریڈیو پاکستان کی ورلڈ سروس نے ایک مباحثہ ریکارڈ کیا اس میں ہاجرہ مسرور' محمود شام' ابوالخیر کشفی اور نصراللہ خاں "حریت" کے کالم نویس بھی شامل تھے۔ یہ پہلے انٹرویو سے زیادہ طویل تھا اور ہم نے جی بھر کے زندگی کے ہر پہلو پر بات چیت کی۔ ہندوستانی ادیبوں کی خیر خیریت سے لے کر ترقی پسند اور جدید ادب تک سب کو کھنگال ڈالا۔ ادب میں جمود ہے یا نہیں' ہے تو کیوں ہے۔ نئے ادیب کی مشکلات۔ وہ ماحول جس سے نیا ادب اکتایا ہوا ہے۔ اور اکتا کر اپنے اندر ہی اندر گھس کر زندگی کے ہر سوال کا جواب مانگ رہا ہے۔

"نئے ادیب کو پرانے ادیب چھپنے کا موقع نہیں دیتے۔"

"یہ غلط ہے کیونکہ ہر رسالہ میں اگر ایک کہانی پرانے ادیب کی ہوتی ہے تو چار نئے ادیبوں کی ہوتی ہیں۔"

"پھر تو شاید وہ نئے ادیبوں کی رہنمائی نہیں کرتے۔"

"کیسے رہنمائی کریں؟"

"ایسے کہ پہلی فرصت میں مرجائیں اور وصیت کر جائیں کہ ان کے لبعد ان کی ساری تحریریں جلا دی جائیں۔" میں نے دبی زبان میں رائے دی۔

بات ہنسی میں ٹل گئی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ نئے ادیب بڑی شان سے پیدا ہو رہے ہیں ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ آج کوئی کہانی لکھے اور کل ادیب بن جائے۔ بنتے بنتے سال بیت جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں کہا جاتا ہے کہ اردو کو اس کا حق نہیں ملا نئے ادیب ابھرے ہیں۔ قاضی عبدالستار' غیاث احمد گدی' رام لعل' جیلانی بانو' اقبال متین' واجدہ تبسم' علامتی ادب لکھنے والوں میں بھی ابھر رہے ہیں۔ بلراج منیرا نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ جوگندر پال جم گئے ہیں اور بہت سے نئے لکھنے والوں میں جن کے نام ابھی زبان زدِ عام نہیں ہوئے ہیں اگر ہمت نہ ہار گئے تو ایک باڑھ کی باڑھ اچھے ادیبوں کی کھڑی ہو جائے گی۔ ہندوستان میں اردو کی بقا کا سوال اٹھا۔ میں نے بتایا کہ اردو کے ساتھ ہندوستان میں زیادتی تو ہوئی ہے اسے وہ مقام نہیں ملا جس کی وہ حقدار تھی لیکن اب اسے زندہ رکھنے کے لئے جتن کئے جا رہے ہیں۔ اردو اکیڈمی کی شاخیں

قائم ہو رہی ہیں۔ جو اردو کے ادیبوں کو ایوارڈ دیتی ہیں۔ کتاب چھپوانے کے لئے امداد دیتی ہیں۔ اردو لائبریریوں کو سہارا دے رہی ہیں۔ حال ہی میں بہت سے اردو کے رسالے چل نکلے ہیں۔ کئی صوبوں سے سرکار بھی اردو کے پرچے نکال رہی ہے۔ ہندوستان میں اردو زندہ ہے اور آثار کہتے ہیں زندہ رہے گی۔

"کیونکہ ہندوستان میں اردو نے دم توڑ دیا تو پاکستان کس زبان میں رابطہ قائم رکھ سکے گا۔" ہاجرہ نے کہا۔ اگر پاکستان کو اردو کی ترقی ہندوستان میں منظور ہو تو اسے کون روکتا ہے۔ آیئے اور اردو میں جان بھر دیجئے' ہمارے رسالوں کو اپنا سمجھ کر ان میں لکھئے۔ اردو کے ادیبوں کو ایوارڈ دیجئے۔ ایمانداری سے اردو کے ادیبوں کی کتابیں چھپوا کر رائلٹی دیجئے۔ اردو کے رسالوں کے لئے پاکستان کے دروازے کھول دیجئے۔ ہمیں اپنے کروڑوں پڑھنے والے دیجئے۔ ہر رسالہ پنپ جائے گا۔ کیسا اندھیر ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیب نقصان اٹھا رہے ہیں۔ ادھر ادھر کے پبلشرز مفت کتابیں اڑا کر چھاپ رہے ہیں اور رائلٹی ہضم کر رہے ہیں۔ کیا اس کا کوئی علاج نہیں' کیا دونوں ملک مل کر کوئی ایسی راہ نہیں نکال سکتے کہ غریب لکھنے والے مارے نہ جائیں۔ اس کی محنت پر منافع خور پل رہے ہیں۔ اس بے چارے کی داد ہے نہ فریاد۔" ہم نے ادیبوں اور دونوں ملکوں کے فنکاروں اور دانشوروں کے تبادلے پر بھی غور کیا۔ اور اس فیصلہ پر پہنچے کہ دونوں ملک اس نئے خوشگوار موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بے شک ہمارے ملکوں کے درمیان ناخوشگواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہم مغربی ممالک کی اوٹ پٹانگ نقل تو کر لیتے ہیں لیکن کام کی بات نہیں کرتے امریکہ اور ویت نام کی جنگ کس قدر ہولناک تھی۔ اب سب کچھ فراموش کر کے ایک دوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ باتیں ختم ہوں لیکن وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ پتہ ہی نہ چلا۔ اسی دن شام کو انجمن ترقی پسند مصنفین نے غالب لائبریری میں ایک جلسہ منعقد کیا اور تقریروں اور سوال و جواب کے بعد لوگ اس نتیجے پر پہنچے کہ ترقی پسند تحریک صدیوں سے زندہ ہے اور جب تک انسان زندہ ہے جیتی رہے گی۔ انسان کے عروج کی کوئی حد مقرر نہیں۔ وہ پاتا جائے گا اور زیادہ مانگتا جائے گا۔ آج جو روٹی کپڑے

کے لئے شمشیر بکف ہے کل سب کچھ پا کر مریخ کو فتح کرنے چڑھ دوڑے گا۔ تحریک میں ڈھیل آسکتی ہے وہ بے دم نہیں ہو سکتی۔

سبط حسن، رئیس امروہوی اور بہت سے نوجوان ادیبوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ رات کو شاہد لطیف کے ماموں زاد بھائی پیارے میاں کے ہاں ڈنر تھا۔ بالکل دہلی اور لکھنؤ جیسی شیرمالیں اور بہاری کباب! ترکاریوں کی صورت کو جی ترس گیا ہے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں دعوت ہو جاتی ہے۔ لوگ دعوت میں ارہر کی دال اور ہرے دھنیے کی چٹنی کیوں نہیں کھلاتے؟

بھئی شاہد کے رشتہ دار تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خاطر کرتے ہیں۔ شمشاد اشرف کو نئی سوجھی۔ انہوں نے کراچی کے ساحل سینڈس پٹ پر دعوت کر ڈالی۔ سمندر کے کنارے جوہو کی طرح بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں عوام نہیں جاتے۔ ایک تو شہر سے بہت دور نہ سواری کا کوئی انتظام۔ دوسرے وہ بنگلے رئیسوں کے لئے ہیں جنہیں وہاں جانے کی فرصت نہیں۔ کراچی میں کوئی ایسا سمندر کا کنارہ نہیں جہاں چوپاٹی اور جوہو اور شیواجی پارک کی طرح روز میلے لگتے ہوں۔ کلفٹن پر سمندر بہت دور ہے موٹر سے جانے کا راستہ نہیں۔

سینڈس پٹ بہت خوبصورت بیچ ہے۔ بچے سمندر میں کھیلتے رہے چکنے پتھر اور سیپیاں جمع کرتے رہے ایک سانپ والا بین بجانے آگیا۔ دو تین اونٹ والے بچوں کو اونٹ پر گھمانے آگئے۔ ہم نے بھی پانی سے پیر بھگو لئے۔ کھانے یہاں بھی مرغن تھے۔ شیرمال اور بریانی۔

اسی شام اردو کونسل کا جلسہ تھا زاہدہ حنا نے خوش آمدید کہا۔ اس کے بعد رئیس امرہوی، محسن بھوپالی اور اختر انصاری نے کلام سنایا۔ تین تاریخ گزری۔

چوتھی اکتوبر کو علی گڑھ اولڈ گرلز ایسوسی ایشن نے عصرانہ دیا۔ یہ بڑی دلچسپ میٹنگ رہی۔ بڑی دیر تک تو ہم ایک دوسرے کو پہچان پہچان کر گلے ملتے رہے۔ اچھن آپا، بسم اللہ آپا خورشید جو کالج کے دنوں میں خورشید حاجی حسن کہلاتی تھیں۔ محمودہ غیاث، خوب خوب پرانی صحبتوں کے ذکر ہوئے۔ وہ شرارتیں وہ سزائیں آلہ بی کا پیار

پاپا میاں کی شفقت۔ ان کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ کالج وجود میں آیا اور دور دور کی لڑکیاں یکجا اکٹھی ہو کر ایک دوسرے سے اتنی قریب آ گئیں۔ اور پھر حمید جہاں جنہیں زندگی کے ہنگاموں سے پیار ہے۔ وہی اس ایسوسی ایشن کی کرتا دھرتا ہیں۔ میٹنگ ختم ہونے سے پہلے عذرا حیدر اور حسنہ بھی آ گئیں۔ اور پھر سے گلے ملنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ "لڑکیاں" جنہیں میں نے تیس بتیس برس بعد دیکھا تھا۔ جو اتنی بدل چکی تھیں کہ میں انہیں پہیلیوں کی طرح بوجھ رہی تھی۔

کچھ لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو پاکستان میں پیدا ہوئی تھیں جنہوں نے علی گڑھ کالج کے قصے اپنی ماؤں سے سن رکھے تھے۔ جو علی گڑھ سے کوئی رشتہ محسوس کرتی تھیں۔ اپنی ماؤں کی شرارتوں اور سزاؤں کے ذکر سن کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ یہ ذمہ دار بزرگ خواتین جو ہر دم نصیحتیں کرتی رہتی تھیں۔ کبھی ڈانٹیں بھی سنا کرتی تھیں اور رات کو اٹھ کر کاجل سے سوتی ہوئی لڑکیوں کے مونچھیں لگایا کرتی تھیں۔ یہاں ہم نے نہ علم و ادب کی باتیں کیں نہ علاماتی ادب کی تفسیر پر مغز مارے نہایت چھچھوڑی اور پھوہڑ قسم کی گپیں ماریں۔ بچوں کی طرح ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ٹھونسی اور قہقہے لگائے۔ محفل بکھری تو جی بھاری ہو گئے اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ یوں بچپن بار بار لوٹ کر کب آتا ہے۔

رات کو محمد حسین کے ہاں ڈنر تھا۔ وہ کئی دن پہلے دعوت صادر کر چکے تھے اور احتیاطاً روز دھمکیوں بھرا ٹیلی فون کر دیتے تھے۔ وہ پہلے ہی سبحان اللہ تھے۔ اب تو اور بھی بوکھل ہو گئے ہیں۔ دل کے مریض ہیں اور مصنف بن چکے ہیں۔ ان کے ہاں پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے اس لئے وہ گھر پر بار بار ٹیلی فون کھڑکھڑا رہے تھے۔ انہوں نے ایک کتاب خاصی زناٹے دار لکھ دی۔ بھول چوک میں کبھی ان سے خلاف امید باتیں ہو جاتی ہیں۔ جنہیں ان سے وابستہ کرتے ہوئے تکلف محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے کچھ حصہ اس کتاب میں سے پڑھ کر بھی سنایا جو انہوں نے میرے ہی بارے میں لکھا تھا۔ کھانا مرغن اور مجرب تھا۔ جیسا کہ کراچی کا دستور ہے۔ سادی روٹی کو جی ترس گیا کاش کوئی اللہ کا بندہ جو کی روٹی پہ لہسن کی چٹنی اور پیاز کی ڈلی رکھ کر بھی کھلا دیتا۔ محمد حسین

کے ہاں رفعت اور موتی بیگم میرے ماموں زاد بھائی اور بھاوج بھی ملے۔ ان دونوں سے گھٹ کر باتیں کرنے کا ارمان ہی رہ گیا۔ فرصت ملے تو تین چار دن جا کر ان کے ساتھ رہوں۔ چھ اکتوبر کو ڈیپارٹمنٹ آف فلمز میں غالب پر ایک ڈیکومنٹری دیکھی۔ اس کا اسکرین پلے اور ڈائرکشن خلیق ابراہیم نے کیا ہے۔ بے حد خوبصورت رنگین فلم ہے۔ پونے دو لاکھ میں ایسی فلم بنانا حیرت کی بات ہے۔ بہ خوبصورت موسیقی ہے۔ فلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیق ابراہیم کو موضوع سے گہری دلچسپی رہی ہوگی۔

شام کو سلطانہ مہر ایک ابھرتی ہوئی ادیبہ کی کتاب "بیبیاں" کی رسم اجراء میں شرکت کرنا تھی۔ بڑا زبردست مجمع تھا۔ یہاں بھی وہی سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پاکستان کے نوجوانوں کے دماغ میں کتنے سوالات اودھم مچا رہے ہیں۔ اس دوری نے ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے کتنا اجنبی بنا دیا ہے۔ ان کی اتنی دلچسپی دیکھ کر پتہ چلا کہ نوجوان طبقہ کو ادب کے مستقبل کی فکر ہے وہ خود کو کچھ کھویا ہوا سا محسوس کرتے ہیں۔ معیاری ادب ذریعہ معاش نہیں بن پاتا۔ ہلکے پھلکے مزے دار ادب کی مانگ کھپت ہے۔ کوئی ادیب صرف کہانیاں اور ناول لکھ کر گزر اوقات نہیں کر سکتا اس کو زندہ رہنے کے لئے کوئی اور کام کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان میں بھی ادیب کی حالت کچھ ہندوستان سے زیادہ مختلف نہیں۔ حالانکہ وہاں بہت زیادہ رسالے نکلتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ وہاں بھی کاروباری ادب کام آتا ہے۔

اور لوگ کہتے ہیں "ادیب اور شاعر کو ادب کی خدمت کرنا چاہئے۔ دولت کمانے کی طرف نہیں لگنا چاہئے۔" حالانکہ ادیب کو بھی جینا ہوتا ہے۔ مکان کا کرایہ دینا ہوتا ہے۔ گھر چلانا پڑتا ہے۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جبکہ چھوٹے چھوٹے پبلشر عیش کر رہے ہیں۔ کوئی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جو اپنے قلم سے گھر، موٹر اور ٹیلی فون کا خرچہ برداشت کر سکے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد والدین چاہتے ہیں بیٹا بیٹی اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ جو انہیں زندگی سے ملا ہے اسے لوٹانے کی فکر کریں۔ شادی کر جائیں اور پر امن شہری کی طرح زندگی کی گاڑی میں جت جائیں۔

عموماً لڑکیوں پر لڑکوں سے کم ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ پاکستان میں لڑکیاں بڑی

تیزی سے لکھ رہی ہیں۔ شاعری کے میدان میں بھی آگے بڑھ رہی ہیں۔ بڑی تعداد میں ناول شائع ہو رہے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مرد عورتوں کے نام سے ناول لکھ کر چھپواتے ہیں تو زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ یہ رومینٹک ناول ہوتے ہیں۔ اور مہینے میں دس بارہ مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔ ایک خاص طبقہ انہیں بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ ان کے علاوہ جاسوسی ناولوں کی بھی بڑی کھپت ہے۔ بعض ادیب مختلف ناموں سے ایسے ناول مہینے میں پانچ چھ لکھ ڈالتے ہیں۔ اور ان کا کام چل جاتا ہے۔ یہ ناول ایسے ہیں کہ اپنا گہرا نقش نہیں چھوڑتے یاد بھی نہیں رہتے انہیں تفریح کے لئے پڑھ کر بھلا دیا جاتا ہے اور پھر پڑھ لیا جاتا ہے۔ جب سے ٹی وی آیا ہے لوگوں کا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ پاکستان میں ٹی وی کا پروگرام کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ ہفتہ میں تین چار ڈرامے آتے ہیں۔ کوئی ناول قسط وار پیش کیا جاتا ہے۔ جو بہت مقبول ہوتا ہے۔ میں جب وہاں گئی تو

اے آر خاتون کا ناول "شمع" چل رہا تھا لوگ ہر کام چھوڑ کر اسے بڑے انہماک سے دیکھتے تھے۔ ایک صاحبہ کے بیٹے کی شادی تھی۔ اتفاق سے مہندی کی رسم کے لئے وہی وقت مقرر کیا جانے لگا جو "شمع" کے لئے وقف تھا۔ ان صاحبہ نے کہہ دیا میں اس وقت شریک نہیں ہو سکوں گی اس وقت "شمع" دیکھتی ہوں۔ نکاح کی گھڑی ٹل جائے مگر "شمع" کے وقت میں خلل نہ پڑے۔ اچھے اور مانے ہوئے ادیب ٹی وی کے لئے لکھتے ہیں اور بڑا معقول معاوضہ پاتے ہیں۔ مختلف کمپنیاں ان پروگراموں کا خرچہ برداشت کرتی ہیں۔ بیچ میں پروگرام روک کر ان کی کمپنی کا اشتہار چلتا ہے۔

جمیل الدین عالی مع اپنی بیگم کے رات کو ملنے کے لئے آئے۔ بہت دیر تک باتیں چلتی رہیں۔ عالی شاعر بھی خوب ہیں مگر ان کی باتوں میں وقت ایسے گزر جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔

سات اکتوبر کو نیشنل میوزیم دیکھنے گئے۔ وہاں پروفیشنل وویمن، امریکی کونسلیٹ کی بیگم مسز مور کو استقبالیہ دے رہی تھیں۔ خواتین نے مجھے بھی پکڑ لیا اور میوزیم نہیں دیکھ سکی۔ مسز مور نے بتایا کہ امریکہ میں کیسے خواتین گھرداری سے وقت نکال کر سوشل ورک کرتی ہیں ادبی مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں۔ اسکاؤٹس میں دلچسپی لیتی ہیں۔

بڑے ذمہ داری کے عہدے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ سیاست میں بھی پیچھے نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان عورتوں کے بارے میں ہمارے ملکوں میں یہ سب کچھ کیوں نہیں پایا جاتا۔ ہمارے یہاں تو آپ کے گاہک اور گندی کتابیں' سستے' میگزین اور مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ میں عورتیں یا تو کال گرلز ہیں یا ذہنی بیمار۔ آپ لوگ ایسے کوڑے پر پابندی کیوں نہیں لگاتے۔ اس سے آپ کے ملک کی مسخ تصویر دوسروں تک پہنچتی ہیں۔ جو میگزین عام طور پر بکتے ہیں ان میں سوائے مردوں کو لبھانے کی ترکیبوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور آگے قدم بڑھتا ہے تو ننگی تصویریں ہوتی ہیں۔ "ویمن کلب" کو مسخ صورت میں پیش کر کے صرف جنسی بے راہ روی کا جھنڈا اونچا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے عوام تو بس اتنا ہی پڑھ پاتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ امریکہ دوسرے ملکوں کے ہاتھ ہتھیار بیچتا ہے جن سے تباہیاں جنم لیتی ہیں۔ برسوں سے کوئی ایسی فلم نہیں دیکھی جس میں امریکہ کی گھریلو عورت کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ یا رنگ اور نسل کے سوال کو سلیقے سے سلجھایا ہو۔ "کہنے لگیں۔ آپ ہماری امریکی لائبریری میں ایمبیسی آکر مطالعہ کیجئے۔"

"مگر آپ کی ایمبیسی میں عام انسان کی پہنچ کہاں ہے۔ آپ یہ مواد پڑھے لکھے سنجیدہ طبقہ تک تو تھوڑا بہت پہنچا سکتے ہیں مگر عوام کو آپ ایک سرے سے نظرانداز کر جاتے ہیں۔"

"ہم گندے ادب پر روک تھام نہیں لگا سکتے کہ وہ ایک بیوپار ہے اور بیوپار میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ اس پر ہم امریکہ میں بھی پابندی نہیں لگا سکتے کہ ہمارے ملک میں ہر شخص کو اپنے خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی ہے۔"

"اشتراکیت کے بارے میں بھی خیال کے اظہار کی اتنی ہی آزادی ہے؟"

تو ہنسنے لگیں۔

رات کو کھانا شاہد لطیف کے ماموں زاد بھائی اختر کے ہاں کھایا۔ متواتر دعوتیں کھانے سے طبیعت پر گرانی ہونے لگی تھی۔

○ آٹھ اکتوبر کو مدیر "سب رنگ" شکیل عادل زادہ کے ہاں ڈنر تھا۔ بے حد

تصویریں کھینچی گئیں۔ جمیل الدین عالی، جوان ایلیا اور شان الحق نے اپنا کلام سنایا۔ عالی کے دوہے خوب ہیں۔ ہندی کے نازک اور خوبصورت الفاظ کو بڑے حسن سے اردو میں سمویا گیا ہے۔ عالی کے ہاں غضب کا ترنم ہے ان کی اپنی طرز بھی خوب ہے۔

حقی صاحب کے ہاں گہراؤ اور لطافت کا میل ہے جدید شاعری پر بات چیت ہوتی رہی۔ میں ویسے ہی شاعری کو زیادہ تر سن کر لطف اندوز ہوتی ہوں۔ جدید ترین شاعری اپنے پلے نہیں پڑتی مگر پاکستانی کے علامتی شعراء اتنے مبہم نہیں لگے۔ منیر نیازی کے کلام میں نیا پن ہوتے ہوئے اجنبیت نہیں۔ منیر نیازی بڑے وجیہہ اور بانکے شاعر ہیں۔ ہندوستان میں بڑی پابندی سے چھپتے ہیں میں تو سمجھتی تھی وہ ہندوستان کے شاعر ہیں۔ رائٹرز گلڈ کی طرف سے عصرانہ تھا۔ کچھ شعرا نے اپنا کلام بھی سنایا۔ اتنی محفلوں میں، میں بول بول کر تھک چکی ہوں۔ ہر نیا گروہ لوٹ کر وہی پرانے سوال کر رہا تھا۔ ایک نوجوان سندھی شاعر نے اپنا کلام اور اس کا ترجمہ سنایا۔ نئے شاعر وہ کسی زبان کے بھی ہوں پاکستان میں بہت جوش و خروش کی شاعری کرتے ہیں۔

رات کو ذکیہ سرور کے ہاں ڈنر تھا۔ فیض اور زہرہ نگاہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ زہرہ نے فیض کی غزلیں ترنم سے سنائیں۔ ان کے وہ اشعار جن میں انہوں نے جذبات کو رنگوں سے تشبیہہ دی ہے اور پھر زہرہ کا خلوص اور میٹھی آواز ایک جادو سا طاری ہو گیا۔ ذکیہ بڑی جاندار اور تیز طرار لڑکی ہے ضرور ڈاکٹر ہیں۔ مگر شاعری سے بڑا لگاؤ ہے۔ کئی نوجوان پاکستان کا قومی لباس یعنی ہم رنگ شلوار قمیض پہنے تھے خاص طور پر زہرہ کے بھائی بڑے سج رہے تھے۔ یہ عوامی لباس ہر فرقے کے لوگ بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ نوکر باورچی بھی اس لباس میں بڑے صاف ستھرے لگتے ہیں۔ گہرے رنگ پہنتے ہیں۔ سڑک پر چلنے والے میلے نہیں لگتے۔ یو۔پی سے گئے ہوئے لوگ بھی جو کبھی شلوار پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اس لباس کو اپنا چکے ہیں۔ یو۔پی اور دوسرے صوبوں سے گئے ہوئے اتنے سال پاکستان میں رہنے کے بعد بھی مہاجر کہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ انہیں تلیر اور مکڑ یعنی ٹڈی بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ کراچی میں بڑی تعداد میں بس گئے ہیں۔ زیادہ تر آپس ہی میں ملتے جلتے ہیں۔ پنجابی اور سندھی ان کی گٹھ بندی پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ مگر اب لباس کو اختیار کر کے اس فرق کو مٹانے کی کوشش کر

رہے ہیں کیونکہ یہ سندھیوں کا لباس ہے۔ ادیب بھی سندھی بلوچی اور پنجابی کے الفاظ اور ترکیبیں اردو میں استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ایک خوشگوار قدم ہے۔ اور پاکستان کے ادب پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ اردو زبان پر ہندوستان میں برج اور پوربی کا تو کافی اثر رہا ہے۔ مگر گجراتی سندھی مراٹھی اور باقی کی ملک میں بولی جانے والی زبان سے کوئی قابل ذکر استفادہ نہیں کیا گیا۔ حیدر آبادی ادیبوں نے حیدر آبادی زبان کو اردو میں جگہ دے کر قابل ذکر کام کیا ہے۔ اردو کو اور پھیلنا چاہئے۔ ویسے پاکستانی اور ہندوستانی اردو میں فرق پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی اردو ہندی کے میٹھے الفاظ اٹھا رہی ہے۔ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ معرب اور مفرس ہوتی جا رہی ہے۔ ہندی کے بارے میں مجھے وثوق سے نہیں معلوم مگر میرے دوست راج بیدی کا کہنا ہے کہ نئے لکھنے والے ہندی کو اردو سے قریب لا رہے ہیں۔ میں نے یہی بات پاکستان کی محفلوں میں دہرا دی۔

دس تاریخ کو سہام مرزا اور ان کے عملہ کے ساتھ چوکھنڈی جھنبھور اور ماہلی ہلز گئی۔ چوکھنڈی میں پرانے قریب قریب نامعلوم زمانے کی قبریں ہیں۔ ان پر اس قدر خوبصورت اور نازک کام کیا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سنار نے پتھر پگھلا کر سانچوں میں ڈھالا ہے۔ عربی رسم الخط میں کچھ لکھا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا اور نہ کچھ تحقیقات کی گئی ہے۔ کوئی احاطہ ہے نہ دروازہ۔ ببول اور تھوہڑ کے درخت اگ رہے ہیں نہ کوئی گائیڈ نہ چوکیدار چھوٹی بڑی بہت سی قبریں ہیں۔ مردوں کی قبر پر تلوار اور ڈھال بنی ہے عورتوں کی نشاندھی زیوروں کی نقاشی سے کی گئی ہے۔ وہ زیور ایسے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں آج بھی پہنے جاتے ہیں۔ مثلاً جھمکے، چندن ہار، گلوبند کنگن اور چوڑیاں۔

کراچی سے ایک دفعہ نکل جاؤ تو میلوں کوئی آبادی نظر نہیں آتی شہر ایک دم سے ختم ہو کر ویرانہ شروع ہو جاتا ہے۔ راستے میں دو چار فیکٹریاں ہیں جو کوئلے کی قلت کی وجہ سے بند پڑی ہیں۔ کبھی کوئی ایک آدھ بس ٹوٹی کھڑکھڑاتی گزر جاتی ہے اور بس. کھانا ساتھ بہ افراط تھا مگر کھانے کی جگہ کہیں نہ ملی۔ میلوں چلتے گئے۔ ایک

جھیل کے کنارے ایک بنگلہ نظر آیا مگر وہاں کوئی افسر چھٹی منا رہے تھے۔ پھر میلوں چلتے رہے۔ دور دور کہیں سائے دار پیڑ کا نشان نہیں۔ بڑی مشکل سے ایک ٹوٹی بوسیدہ سی کاٹج ملی۔ جہاں نل ٹوٹے ہوئے تھے اور فرش پر دو گدے پڑے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی لہٰذا وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ رخسانہ سہام مرزا ایڈیٹر "دوشیزہ" نے گرمے کاٹ کر ڈھیر لگا دیا۔ گلاوٹ کے کباب اور شیرمال پر ہم لوگ ٹوٹ پڑے۔ ان کبابوں کے آگے مرغی بھی پھیکی لگی اور گرمے نے تازہ کر دیا۔ بہت میٹھے اور رسدار تھے۔

واپسی میں راستہ میں ایک سندھی کڑھن کے کام کی دکان نظر آگئی۔ دکان کیا تھی ایک گلزار کھلا ہوا تھا غریب سندھی عورتیں رلیاں یعنی اوڑھنے کی چادریں بڑے خوبصورت رنگ کے ٹکڑوں کو بناتی ہیں ان کی شہر میں بڑی مانگ ہے۔ میں جس چیز کو ہاتھ لگاتی سہام مرزا اسے خریدنے کی دھمکی دیتے نہ نہ کرکے بھی انہوں نے پلنگ پوش اور کشن کور خرید ہی ڈالے۔

پاکستان والوں کو تحفہ دینے کا جنون ہے۔ بالکل اجنبی تحفے لیے چلے آرہے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو شیشے کے کام کے بنے ہوئے ٹکڑے ہی سہی کتابیں تو اتنی ملیں کہ میں وزن کے خوف سے لا بھی نہ سکی چھوڑ آئی۔ مدحت نے وعدہ کیا ہے وہ آہستہ آہستہ مجھے بھیجتی رہے گی۔

شام کو ہاجرہ مسرور کی بیٹی کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ لڑکی والے دولہا کو مہندی لگانے آرہے تھے بے چارہ دولہا لڑکیوں کا تختہ مشق بنا ہوا تھا۔ ایک طرف بہت سی خوبصورت خوش لباس لڑکیاں بیٹھی ڈھولک کے گیت گا رہی تھیں۔ سب ہی کنواری بیاہی لڑکیاں نک سک سے درست بنی سنوری تھیں۔ خدیجہ مستور بھی لاہور سے آئی ہوئی تھیں مع ظہیر بابر کے احمد ندیم قاسمی بھی باہر مردانے میں ملے۔ خدیجہ کو میں نے جب سن بیالیس میں دیکھا تھا۔ بمبئی میں تو وہ نازک سی بچی تھیں۔ نازک تو وہ اب بھی ہیں۔ لیکن ماشاء اللہ ماں بن کر کچھ گھمبیر ہوگئی ہیں۔ ہاجرہ بھاری بھرکم اور ویسی ہی باتونی ہیں جیسا وہ لکھتی ہیں۔ ان دونوں بہنوں نے پاکستانی ادب کو بہت سنوارا ہے۔ اور بہت ہر دل عزیز ہیں۔ ہاجرہ کے شوہر احمد علی کچھ

زیادہ ہی دلہن کے باپ لگ رہے تھے اور بڑے خاموش تھے۔ بہت لوگوں نے ادب کو ٹھونسنے کی کوشش کی مگر شادی کے گھر کے ماحول میں دال نہ گلی۔

کلب میں شادی کا ریسپشن تھا۔ پاکستان میں شادیوں پر خرچہ پر پابندی عائد ہوگئی ہے ورنہ لوگ ہزاروں روپیہ روشنیاں لگانے میں خرچ کرتے تھے۔ شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ چڑھاوے اور جہیز کی کوئی نمائش نہیں ہوئی۔ چپ چاپ صندوق میں بھر کے دولہا دلہن کے سپرد کردیا گیا۔

بیویاں بھڑک دار لباس پہنے تھیں اور زور دار میک اپ کیے تھیں۔ خالد لطیف کی بیٹی لبنیٰ تو بہت بھاری جوڑے میں دلہن کو مات کر رہی تھیں۔ ہر طرف بھاری کارچوبی اور بنارسی غرارے گھوم رہے تھے۔

دس تاریخ کو کراچی میونسپل کارپوریشن کے پی۔ آر۔ او نے ڈنر دیا۔ کراچی کے ادیب اور شعراء شریک تھے گیارہ کو زادہ حنا نے چائے پر بلایا اپنی کہانی پڑھ کر سنائی کہانی میں اپنے پرانے وطن ہندوستان کی بھولی بسری یادوں کا تجزیہ کیا ہے وہ کچا صحن پھلواری کی کیاریاں گھڑونچی پر رکھی تازہ پانی کی کوری ٹھلیوں پر موگرے اور چمبیلی کے ہار۔ انسان کہیں چلا جائے۔ بچپن کی سہانی یادیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ رضیہ فصیح الدین اور سلطانہ مہر نے بھی کہانیاں پڑھیں۔

اسلام آباد سے اختر جمال کا فون آیا کہ کب آرہی ہوں میں نے کہہ دیا لاہور پہنچ کر بتاؤں گی۔ لاہور سے طفیل احمد کا فون آیا کہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج رہے ہیں۔ مجھے لاہور آنا ہی پڑے گا۔ چنانچہ بارہ اکتوبر کو لاہور پر دھاوا بول دیا میرے ساتھ مدحت بھی گئیں۔ اور ڈاکٹر عطیہ فیضی میری خالہ زاد بہن بھی اپنے بیٹے دلاور کو ساتھ لے کر گئیں کہ کراچی میں تو لوگ مجھے گھر پر نہیں چھوڑتے اطمینان سے بات کرنے کی بھی مہلت نہیں۔ عطیہ سے پندرہ سولہ سال بعد ملنا ہوا تھا۔ وہ میری بڑی چہیتی ہوا کرتی تھی۔

لیجیے عید کا ذکر کرنا تو بھول ہی گئی۔ عید کی رات سہام مرزا اور رخسانہ شہر کی روشنیاں دکھانے لے گئے۔ چاند رات کی گہما گہمی اور آخری وقت کی خرید و فروخت میں لوگ مدہوش ہو رہے تھے۔ سارا شہر چھوٹے چھوٹے روشنیوں کے

قمقموں سے جگمگا رہا تھا- ایک ایک عمارت دلہن بنی کھڑی تھی- کچھ عارضی دکانیں بھڑکدار خیمے لگا کر تیار کرلی گئی تھیں جہاں چوڑیاں جوتے اور کپڑے پھیلے ہوئے تھے لوگ دکانوں پر ٹھٹ لگائے تھے- سارے کراچی کی موٹریں نکل پڑی تھیں- مگر کراچی کے لوگ غل غپاڑہ نہیں کرتے چپ چاپ خرید و فروخت ہو رہی تھی- کتابوں کی دکانیں بھی کھلی تھیں گو وہاں بھیڑ نہیں تھی- میں نے دیکھا کہ میری تمام کتابیں لوگوں نے مزے سے چھاپ لی ہیں اور چار پانچ نئے مجموعے اور چھپ گئے ہیں جن میں وہ کہانیاں مل گئیں- جو میری دانست میں کھو چکی تھیں- نہ جانے یہ کہانیاں کس راستے وہاں پہنچیں اس زمانہ کی کہانیاں بھی مل گئیں جو بڑے گھمبیر وقت میں چھپی تھیں جب آمدورفت بالکل بند تھی- معلوم ہوا رسالے اور کتابیں ولایت جاتی ہیں وہاں سے پاکستان پہنچ جاتی ہیں- دو ڈھائی بجے تک گھومتے رہے پھر میں نے کہا مجھے اپنی بڑی بہن رفعت خانم کے ہاں جانا ہے میں تین بجے وہاں پہنچی سب سو رہے تھے مگر پھاٹک اور دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا میں بڑی آسانی سے جاکر پلنگ پر لیٹ گئی-

صبح عید کے ہنگامے رہے لوگ ملنے آتے جاتے رہے مدحت اس کی بیٹی رانی اور بیٹا بلم رانی کے بچے اور دلہن بھابی آگئے-

آپا کتنی بوڑھی ہوگئی ہیں- ہماری سب سے بڑی بہن ہیں سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہیں کمسنی میں بیوہ ہو گئیں تین بچے رو رو کر پالے- جب جوان ہوئے اور شادیاں ہوگئیں تو ملک تقسیم ہوگیا ایک بیٹا ڈاکٹر مجیب علی گڑھ کالج میں اور دوسرا بیٹا کرنل حبیب پاکستانی فوج میں بیٹی بھی پاکستان میں آپا بھاگ بھاگ کر کبھی پاکستان جاتیں وہاں سے مجیب کی یاد ستاتی تو علی گڑھ آجاتیں- گزشتہ اٹھائیس سال سے وہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوڑیں لگا رہی ہیں بڑی مصیبتوں سے ویزا ملتا ہے- در در کی خاک چھانتی ہیں لیکن سکون قلب کہیں نہیں ملتا تینوں بچوں کے ساتھ نہیں رہ پاتیں- ظاہر ہے اس قسم سے ان پر کیا گزری اور نہ جانے کتنی ماؤں پر گزر رہی ہوگی- جو باتیں وہ دونوں ملکوں کے بارے میں کہتی ہیں اگر لکھ دی جاتیں تو آپا دونوں جگہ فی الفور قتل کردی جاتیں-

اور پھر ڈاکٹر مجیب کو ہارٹ اٹیک ہوا نہایت شدید قسم کا آپا پاگلوں کی طرح بڑی جدوجہد کے بعد علی گڑھ پہنچیں ادھر حبیب کو بھی دل کا دورہ پڑ گیا اور بیٹی نیر کے شوہر بھی دل کے ہاتھوں بے بس ہو گئے ان دونوں ملکوں نے نہ جانے کتنے دلوں کا قیمہ بنا دیا۔ اس خون سے پیاس نہیں بجھی جو بٹوارے کے وقت بہا اب بھی بلی چڑھ رہی ہے۔

ڈاکٹر مجیب کا ایک سال کی مسلسل بیماری کے بعد انتقال ہو گیا۔ آپا پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب وہ کچلی جاتی ہیں تو سر نہیں جھکاتیں۔ جد امجد چنگیز خان کی طرح ننگی تلوار کی طرح تن جاتی ہیں اور ان کی زبان سے زہر ٹپکنے لگتا ہے وہ زہر ان صفحوں پر نچوڑ دوں تو بھڑک اٹھیں اور نہ جانے کیا کچھ خاکستر ہو جائے۔

آپا بیاسی برس کی ہیں ہر سانس میں شعلے اگلتی ہیں اور ان میں خود ہی بھسم ہوتی رہتی ہیں "ہائے مجیب!" ان کی زبان پر رہتا ہے مرنے کی آرزو میں مرتی ہیں مگر دم نہیں نکلتا۔ عمر نے حس کو گند نہیں کیا اپنی جگہ تمام احساسات جاگ رہے ہیں ذہنی طور پر نہایت چاق و چوبند ہیں اپنا کام خود کرتی ہیں۔ کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ حبیب نے پنشن لے لی ہے۔ ان کے تخت کے پاس پلنگ پر لیٹے رہتے ہیں گولیاں نگلتے رہتے ہیں۔ آپا سہمی ہوئی چوکنی ہو کر انہیں دیکھتی رہتی ہیں جیسے چڑیا اپنے بچے کو تاکتی ہے کہ پیڑ کے تلے اژدہا پھنکارتا رہتا ہے جیسے وہ بیٹے کی طرف قدم بڑھانے والے ملک الموت کا گریباں ہی تو پکڑ لیں گی اور جب مجیب کا بیٹا بیلو جو علی گڑھ میں لکچرار ہے یاد آتا ہے تو وہ پھر دھیمے دھیمے سلگنے لگتی ہیں۔

عید منا کر میں لاہور پہنچی نہ جانے کیسے اجازت لے کر صفیہ منٹو اپنی نواسی کا ہاتھ پکڑے ہوائی جہاز تک آن پہنچیں ہم دونوں وہیں ایک دوسرے سے چمٹ کر خوشی سے رو پڑے منٹو بے حد یاد آیا۔ باہر نصیر خورشید اکبر منور رفعت اور بہت سی لڑکیاں موجود تھیں۔ میں نصیر سے گلے مل رہی تھی اور بوکھلا کر اس کی بہن منور سے پوچھ رہی تھی نصیر کہاں ہے۔ میں نے نصیر کو چونتیس برس بعد دیکھا۔ آمنہ اور منظور خدیجہ عمر بھی تھیں۔ میں خدیجہ عمر کے ساتھ اس کی کوٹھی پر چلی گئی۔ آمنہ،

خدیجہ، سلطانہ جعفری کی بہنیں ہیں اور برابر ہندوستان آتی رہتی ہیں اس لئے ان کو پہچاننے میں تو دیر نہ لگی لیکن بہت سی صورتیں ذہن سے اتر گئی تھیں۔

دوسرے دن عزیز الحسن کے ساتھ شاہ نور اسٹوڈیو گئی۔ اسٹوڈیو کے مالک ہندوستان کے مشہور ڈائریکٹر شوکت حسین نے اسٹوڈیو دکھایا۔ بڑا سجا ہوا بنا ہے کاروباری جگہ معلوم نہیں ہوتی کچھ پرانی مغل عمارتوں کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شوکت حسین نے یہاں سے جاکر خاندان، دوست، زینت اور جگنو جیسی کامیاب فلمیں بنائیں کیا بات ہوئی۔ وہ کچھ اکتائے سے نظر آرہے تھے۔ اتنا شاندار اسٹوڈیو ہوتے ہوئے بھی انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جو ہندوستان میں ہوئی تھوڑی دیر چپ رہے پھر کہنے لگے پاکستان کی فلم انڈسٹری اس لئے اتنی ترقی نہ کر سکی کیونکہ یہاں سینما ہال بہت کم ہیں سارے ملک میں آٹھ ساڑے آٹھ سو سینما ہال ہوں گے۔ پروڈیوسر کو روپیہ نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔

"ہندوستانی فلموں پر پابندی لگنے سے کچھ یہاں کی فلم انڈسٹری کو فائدہ کیوں نہیں ہوا"۔

کچھ زیادہ تر پروڈیوسروں نے مقابلہ نہ پاکر اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بے دلی سے فلمیں ٹھوکنے لگے۔ ہندوستانی فلموں کے چربے اتارنے لگے۔ فنانسر پیچھے ہٹنے لگے۔ ہمارے اسٹوڈیوز میں نیا سامان بھی نہ آسکا اور ٹیکنیشن کی بہت قلت تھی۔ اس لئے ہماری فلموں کا معیار گر گیا"۔

"اگر دونوں ملکوں کی فلموں کا لین دین چلتا رہتا تو پاکستان کو اتنی بڑی مارکیٹ ملتی ہندوستانی فلموں پر بھی پاکستان کے بند ہو جانے سے بڑی مشکلیں پڑیں۔ آپ نے خود ہی تو تالے ڈالے۔"

"اگر تالے نہ ڈالے ہوتے تو ہماری انڈسٹری آج کو اتنی بھی نہ بچتی۔ سب فلم بنانا چھوڑ کر ڈسٹری بیوٹر بن جاتے اور اس طرح صرف چند لوگوں کی کھپت ہو پاتی۔ سینکڑوں آدمی بیروزگار ہوجاتے کیونکہ ڈسٹری بیوشن میں اتنے عملے کی ضرورت

نہیں ہوتی۔"

مجھے شوکت صاحب کی بات بہت معقول لگی میں نے پوچھا۔

"ٹیلی وژن آنے سے فلموں پر اثر پڑا۔"

"شروع شروع میں بہت بڑا لوگ ٹی۔ وی سے چپکے بیٹھے رہتے تھے لیکن بہت بڑا طبقہ ہے جو ٹیلی ویژن تک نہیں پہنچ سکتا اب ہماری فلمیں حسب توقع چلتی ہیں پہلے تو جب امرتسر ٹی وی پر فلمیں آنے لگیں تو ہمارے یہاں کے لوگ دیوانے ہو اٹھے مگر وہاں سے پرانی سڑی ہوئی فلمیں زیادہ آتی ہیں اب لوگ ٹوٹ کر ہندوستانی فلم نہیں دیکھتے۔

شوکت صاحب سے مل کر بہت خوشی ہوئی بڑے سنجیدہ انسان ہیں اور بڑی نپی تلی باتیں کرتے ہیں۔ ہندوستان کے دوستوں کو یاد کرتے ہیں۔

○ رات کو محمد طفیل نے ڈنر دیا۔ وہاں عبادت بریلوی، وقار عظیم، خدیجہ مستور، عبد الرحیم صاحب اور حجاب امتیاز علی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے حجاب امتیاز علی کو سن پینتالیس میں دیکھا تھا اس وقت بڑی خاموش بڑے تکلف سے چند جملے بولتی تھیں۔ کسی سے بات نہیں کر رہی تھیں۔ لیکن اب تو ان کے تالو سے زبان ہی نہ لگ رہی تھی بڑے جملے بازی کر رہی تھیں۔ کبھی تو خود اپنی تحریروں کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتیں ایک محفل میں ذرا بحث گرم ہوگئی تو جلدی سے بیچ میں آکر بولیں۔

"ارے دیکھئے تو آسمان کتنا حسین ہے۔ چاند بس اب اوپر اٹھنے ہی والا ہے۔ آپ لوگ کیا خوبصورت وقت ضائع کر رہے ہیں۔" سب بحث بھول کر آسمان کو دیکھنے لگے۔ آسمان پھیکا اور بے نور تھا۔

○ عبد الرحیم صاحب نے مجھے مالا مال کر دیا۔ عبد الرحمان چغتائی نے 72ء میں مرقع چغتائی اقبال کی ایک کاپی مجھے بھیجنے کی کوشش کی مگر بہت وزنی کتاب ہے بھیجنے کا کوئی راستہ نہ ملا ان کا 75ء میں انتقال ہو گیا اور میرا تحفہ وہی رہ گیا عبد الرحیم صاحب نے وہ مجھے دیا اس کے ساتھ مرقع چغتائی غالب اور چغتائی کی پینٹنگ کی بھی

ایک کاپی دی دو اور یجنل ریپٹنگ بھی دیں۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے الفاظ نہ مل سکے میں یہاں سے ارادہ کر کر کے گئی تھی کہ اس کی ایک کاپی ضرور کسی نہ کسی طرح حاصل کروں گی شاید طفیل صاحب کام آئیں گے مگر انہوں نے میرا ٹکٹ بھی بھیجا اور بچوں کے لئے تحفے بھی دیئے۔ چودھری صاحب نے میری اتنی کتابیں چھاپیں اور چھاپ رہے ہیں مجھ سے ملنے بھی نہ آئے۔ ٹیلی فون کیا یہی کیا کم مہربانی تھی۔ مجھے ان سے شکایت نہیں بلکہ شکر گزار ہوں کہ اپنے مفاد کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاکستانی عوام تک پہنچنے کا ذریعہ بنے۔

چودہ اکتوبر کو شباب کیرانوی نے ثنائی اسٹوڈیو میں اپنی فلموں کے کچھ ڈرامائی سین کچھ ناچ گانے دکھائے ان میں سے ایک ٹکڑا مجھے بہت پسند آیا اور وہ کسی دن پوری فلم دکھانے کو تیار ہوگئے۔ تیسرے دن انہوں نے اپنے اسٹوڈیو میں ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا فلم دکھائی فلم کا نام تھا انسان اور فرشتہ۔ اس میں باوجود ناچ گانوں کے ان کا بہت روپیہ ڈوبا۔ کیوں کہ سنجیدہ فلم تھی پبلک صرف دھوم دھڑکا پسند کرتی ہے۔ شباب کیرانوی بڑی تیزی سے دھڑا دھڑ فلمیں بناتے ہیں اور وہ خوب چلتی ہیں لیکن انہیں بے مقصدی فلمیں بنانے کا شوق ہے۔ وہ اپنی دوسری فلموں سے نقصان پورا کر لیتے ہیں۔

دعوت میں محمد علی' زیبا اور نیر سلطانہ بھی تھے۔ محمد علی دراز قد وجیہہ پٹھان لگتے ہیں۔ عوامی لباس یعنی گیرُدا رنگ کی شلوار اور قمیض پہنے تھے انہیں پاکستان کا دلیپ کمار مانا جاتا ہے میں نے ان کی دو فلمیں پاکستان میں دیکھیں۔ ایک آدھی ایک پوری۔ "میرے چمن کا پھول۔" ہندوستانی فلم انوراگ کا چربہ ہے۔ مگر کچھ بدل دیا گیا ہے۔ محمد علی اور زیبا نے بہت اچھی کردار نگاری کی تھی۔

حجاب امتیاز علی نے بھی صبح کی چائے پر بلایا۔ پورا کھانا میز پر سجا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں نے نارنگی کی کلیاں اور شمعی انگلیاں بہت ڈھونڈیں کہیں نہیں ملیں۔ وہ بہت بدل گئی ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک مضمون پڑھا جو ان کے اپنے رنگ سے بالکل جدا تھا اس میں طنز و مزاح کی لطیف چاشنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ

ان کے گھر میں پیانو تو تھی۔

خالد لطیف بھی لاہور ساتھ آئے تھے وہ ہمدرد دواخانہ سے وابستہ ہیں۔ اور کوئی کام نکال لیا تھا۔ انہوں نے ایک عصرانہ دیا جہاں کچھ شعراء نے کلام سنایا مگر کسی نے سر دربارہ بنکوی اور قتیل شفائی کو تکلیف نہیں دی جنہیں میں سننا چاہ رہی تھی۔

○ پندرہ کو حفیظ اللہ حسن نے ڈنر دیا انہیں سب پیار میں آپی کہتے ہیں انہیں سب پیار میں آپی کہتے ہیں حفیظ کا بگڑا ہوا ہیولہ وہاں سنتوش کمار ان کی بیگم صبیحہ خانم، وحید مراد جو بڑے مقبول نوجوان ہیرو ہیں شریک تھے۔ فریدہ خانم بھی تھیں اور سب سے بڑھ کر تو نورجہاں تھیں۔ ملکہ ترنم واقعی ملکہ لگتی ہیں سب نے ہندوستان کو یاد کیا خاص طور پر سنتوش کمار نے جو کلکتہ میں ہیرو بنے تھے وہ بھی کسی زمانہ میں پاکستان کے دلیپ کمار مانے جاتے تھے۔ دلیپ کمار کی ہر دلعزیزی کی دوسری مثال مشکل سے ملے گی۔ آج تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ لوگ انہیں معیار ناپنے کا فیتہ سمجھتے ہیں۔

○ فلم رائٹرز گلڈ کے جلسہ میں فیض نے صدارت کی خدیجہ اور ممتاز مفتی نے مضامین پڑھے جن میں میرے اوپر خیالات کا اظہار کیا تھا ممتاز مفتی کا مضمون تیر و نشتر سے لبریز تھا۔ نہایت چست اور چمکیلا چونکہ میرے بارے میں تھا اس لئے چور سی بنی بیٹھی رہی ورنہ بہت داد دیتی پھر بھی چند جملوں پر بے ساختہ داد دینا پڑی۔

○ سترہ کو فلم رائٹرز کی طرف سے ہوٹل لارڈز (LORDS) میں ریسپشن تھا جہاں دونوں ملکوں کی فلموں پر بات چیت ہوتی رہی۔ ان کی مشکلات بھی وہی ہیں جو ہماری، پبلک کی بدمذاقی فنانس کی تنگی اچھے فلم بنانے والوں کے لئے مواقع کی کمی جمیلہ ہاشمی، یاسمین شاہد، بانو قدسیہ اور اشفاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ سب نے کرشن چندر، بیدی، عباس، ساحر اور اختر الایمان کو پوچھا۔ قرۃ العین حیدر کو تو اتنے لوگوں نے پوچھا کہ مجھے محفل میں باقاعدہ ان کے بارے میں ایک لکچر دینا پڑا تھا یاد نہیں کیا جگہ تھی ایک ہال میں مشاعرہ ہوا۔ بہت سے نئے شاعر لڑکوں اور لڑکیوں

نے اپنا کلام سنایا فیض احمد فیض، قتیل شفائی، سردر بارہ بنکوی نے رنگ جما دیا۔
وہاں سے رات کو خدیجہ مستور کے ہاں گئے اور پھر مشاعرے کی وہی محفل جم گئی اور کھانے کے بعد تک چلتی رہی میں سمجھتی تھی اشفاق احمد صرف کہانیاں اور ٹی وی کے ڈرامے لکھتے ہیں مگر انہوں نے اپنی ایک پنجابی نظم سنائی تو وہ شاعر بھی ہیں!
دوسرے دن کچھ سیر کی جہانگیر اور نور جہاں کا مقبرہ دیکھا۔ شاہی مسجد قلعہ اور شالیمار گارڈن کے درشن کئے غرض کچھ چھوڑا نہیں، انار کلی کا بازار بھی دیکھ ڈالا۔

کیسا پر فضا ہے لاہور روح پرور موسم ہریالی ہی ہریالی کراچی میں لوگ پیڑوں کی اولاد کی طرح سیوا کرتے ہیں تب کہیں جا کر روپ رنگ آیا ہے۔ پنجاب کی آپچاؤ زمین آپ ہی آپ سبزہ اگلتی ہے ادھر ادھر سڑک بیچ میں بچی ہوئی سی پتلی نہر، میلوں چلتی چلی جاتی ہے۔

بار بار ٹھٹک جاتی ہوں ریور تاژ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا ہی جارہا ہے ابھی لاہور سے ہی جی نہیں بھرا، اسلام آباد بھی جانا ہے۔ صفیحہ غصہ میں ہے اس کے پاس آکر کیوں نہیں رہی نصیر نے کھانے پر بلایا۔ نصیر جو میری جگری دوست تھی علی گڑھ کی یاد آتی ہے شکر خدا کا کہ علیگڑھ میرا ہے وہاں جانے کے لئے الگ الگ ویزا نہیں لینا پڑتا۔ آپا کی بیٹی نیر پشاور میں ہے۔ عظیم بھائی کا لڑکا واہگہ میں ہے۔ دونوں کو خط لکھ دیئے ہیں کہ اسلام آباد آرہی ہوں آکر صورت دکھا جاؤ پھر نہ جانے کس جنم میں ملنا ہو۔

سوچا اب تک ہوائی جہاز کا سفر ہی رہا ذرا ریل سے بھی پاکستان دیکھ لیں اس لئے اسلام آباد ریل سے چلے۔ محمد طفیل بھی ساتھ آگئے مدحت عطیہ ان کا بیٹا دادر تو ساتھ تھے ہی اسٹیشن پر ایک اور صاحب مل گئے۔ ملتان کے لطیف الزمان کراچی فون بھی کیا تھا اور مجھے ملتان بلانے کی کوشش بھی بہت کی مگر اجازت نہ لے پائے تو لاہور آگئے اور ساتھ اسلام آباد چلے۔ ان صاحب نے راستہ بھر سوالات کی باڑھ جاری رکھی۔ کرید کرید کر نہ جانے کیا کیا پوچھ ڈالا پورے چھ گھنٹہ وہ پوچھتے گئے میں بولتی گئی۔ خیال ہی نہ آنے پایا کہ جواب کیوں دے رہی ہوں مجھے بالکل یاد نہیں کہ

انہوں نے کیا پوچھا اور میں نے کیا بتایا۔ بیچ بیچ میں مشروب چلتے رہے اس لئے حلق بھی نہ سوکھا جو زبان دکھتی۔ بعض وقت تو میں خود اپنے بولنے سے عاجز آجاتی ہوں۔

اسلام آباد کے اسٹیشن پر احسن خان، اختر جمال، میری بھانجی نیران کی بیٹی یاسمین خالہ زاد بہن صفیہ اور اس کے میاں اور بچے موجود تھے۔ نیر کے آنے کی امید نہ تھی اسے دیکھ کر جی کھل اٹھا۔ سولہ برس بعد دیکھا۔ صفیہ اپنے گھر چلی گئی محمد طفیل کسی دوست کے ہاں جا ٹھیرے باقی ہم سب دو کمروں میں جم گئے لطیف الزماں کھانے کے کمرے میں ڈٹ گئے احسن ڈرائینگ روم میں اختر اور اس کی بیٹی تیسرے بیڈ روم میں

پھر ڈھائی دن عورتوں میٹنگوں اور جلسوں میں بیت گئے۔ اب میری دماغی کیفیت کچھ ایسی ہو چلی تھی کہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا کون سی میٹنگ میں کیا ہوا۔ نوٹ لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ اپنے برسوں کے چھوٹے ہوئے رشتہ داروں سے ملوں یا جلسوں میں جاؤں مگر اسلام آباد کا ایک ایک لمحہ ادھر ادھر بکھر گیا۔ میجر زعیم بیگ چغتائی عظیم بھائی کے بڑے لڑکے کو 35 برس ہوئے جب دیکھا تھا مونچھیں نہیں نکلی تھیں اب کنپٹیوں پر سفید بال پھوٹ رہے تھے۔ اس کی بیوی مغل شہزادیوں جیسی حسین ہے اور بیٹیاں بہت بے تکلف اور پیاری ہیں۔

اسلام آباد نہایت صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے۔ جیسے راولپنڈی سے گاڑی اسلام آباد میں داخل ہوئی مہک اٹھی۔ سڑکوں پر جیسے عطر کے قرابے کھل گئے ہوں۔ صبح اس خوشبو کا راز افشا ہوا کہ سڑک پر مہندی کی باڑیں لگی ہوئی ہیں جو پھولوں سے لدی ہوئی ہیں شہر خاموش اور پر سکون ہے۔ ہوا خوشگوار اور ہلکی پھلکی شفاف جیسی باریک ململ میں سے چھن کے آرہی ہو۔

جوش صاحب سے ملنے گئی انہیں تندرست اور چاق و چوبند دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ماشاء اللہ بیاسی سال کے ہیں مگر چہرے کی جلد ترو تازہ اور گلابی ہے۔ بالکل نہیں بدلے چاروں طرف شکرے کی طرح نظر گھمائی نگاہیں ایک حسین پھول جیسی

لڑکی پر ٹھٹک گئیں۔

یہ کس کی بچی ہے؟ انہوں نے شکرے سی دھار دار نظریں گھمائیں۔

"میری نواسی ہے جوش صاحب۔" میں نے پھسلایا۔ بولے۔

"خوب۔"

میں نے ان کی بیاض اٹھائی ایک شوخ سی نظم کا صفحہ کھول کر پڑھنے کی درخواست کی بس چنگاریاں سی چھٹنے لگیں شعلے لپکنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اپنی دبنگ آواز کے زیروبم پر سننے والوں کو بخشیاں دے رہے ہیں۔

دوسرے دن اختر جمال نے لوگوں کو چائے پر مدعو کیا جتنے بلائے گئے ان سے ڈیوڑھے آ گئے ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ سلطانہ جعفری کی والدہ جنہیں ہم آپا کہتے ہیں اپنی چھوٹی بیٹی فاطمہ کے ساتھ آئی تھیں۔ اتنا مجمع دیکھ کر بوکھلا گئیں۔

بات چیت ادب سے شروع ہو کر ایک دم سیاست کی طرف مڑ گئی۔ میں نے جوش صاحب سے ایک بار اور ملنے کی درخواست کی تھی انہوں نے اپنی ایک دعوت رد کردی اور مجھے وقت دیا۔ لوگوں کے سوالات کے نہ میرے پاس ڈھنگ کے جواب تھے اور نہ کج بحثی کا موڈ تھا مگر مہمان مصر تھے اختر جمال پر گھبراہٹ کا دورہ پڑنے لگا۔ میں منہ ہاتھ دھونے کے بہانے سے اندر جا کر لیٹ گئی۔ بلکہ اختر اور احسن نے جھپٹا مار کر مجھے اٹھایا اور اندر لے گئے میں نے صرف اتنا کہا کہ اپنے سوالوں کے جواب چاہتے ہوں تو دونوں ملکوں کے دانشوروں کو کسی جگہ جمع ہونے دیجئے اور جی بھر کے سوال و جواب کیجئے۔ میرا رشتہ تو ادب سے ہے مگر بہت سے سیاسی سوالات کے جواب بھی میں اندازے سے دے دیتی ہوں۔

جب میں جوش صاحب کے ہاں پہنچی تو وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا کلف دار کرتا پاجامہ الگ پڑا تھا۔ وہ تہبند اور ملگا سا کرتا پہنے باہر نکلے اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

"لیجئے آپ اب آئی ہیں جب ہمارا انتقال ہو گیا۔"

مگر پھر ایکدم ان کا موڈ بدل گیا- پھر سے بوتل منگوائی اور جم کر بیٹھ گئے- آج ٹیپ ریکارڈ سامنے ہے- اور جوش صاحب کی طبیعت رنگ پر آئی ہوئی تھی- وہ ایک دم ہندوستان اور اپنے عزیز دوستوں کو یاد کرنے لگے اور سب کے جی بھاری ہو گئے-

رات کو شکر پڑیاں دیکھنے گئے بلندی پر خاصی چڑھائی ایک طرف پنڈی کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں دوسری طرف اسلام آباد کی ایسا لگ رہا تھا کسی نے بہت سے زیور الجھا کر ڈال دیئے ہوں- ہم لوگ دیر تک سانس روکے اس حسین منظر کو دیکھتے رہے-

تب ایک دم مجھے میرین ڈرائیو کا کوئنز نیکلس یعنی مہارانی کا چندن ہار یاد آگیا- بمبئی نے جیسے دھیمے سے پکار لیا-

کراچی واپس لوٹ کر پھر خالد لطیف کے ہاں جا کر دو دن رہی- جی تو چاہتا تھا سب کی دعوت قبول کروں اور سب کے ہاں دو دو دن رہوں' مگر میرے پاس دن کہاں بچے تھے پھر بھی سب رشتہ داروں کے ہاں باری باری دعوت کھائی تحفے سمیٹے اور رخصتی کی تیاری کی-

ایک اور ملاقات کا چلتے چلتے ذکر کروں- مدحت کے شوہر سعید خان بڑے مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں کئی بار عمرہ اور حج کر آئے ہیں- سفید ڈاڑھی رکھتے ہیں جو ان کے نسبتاً جوان چہرے پر ذرا بے تکی سی لگتی ہے- ابھی ایک عدد عمرہ اور کر آئے ہیں ان کے پیر صاحب کو دیکھنے کا شوق اٹھا- آخر ایک شخص میں کیا بات ہوتی ہے جو لوگ مقتد ہو جاتے ہیں- رات کو گیارہ بجے ہم ان کی خدمت میں پہنچے-

اگر نور برس سکتا ہے تو ان کے چہرے پر برس رہا تھا نرم خاموش آنکھیں' دھیمی صاف آواز دبلے پتلے مگر نہایت صحت مند' بات کی قدر نپی تلی مگر مطلب پورا لوگ ان کے پاس اپنے دکھ درد اور الجھنیں لے کر آتے ہیں اور وہ انہیں دعائے دیتے ہیں- کوئی بات ہے کہ انہیں دیکھ کر بڑے سکون کا احساس ہوتا ہے-

رشتہ داروں عزیزوں دوستوں کی تصویریں ڈھیروں تحفے کے سامان کا وزن دوگنا ہوگیا۔ ایئرپورٹ پر پہنچانے کے لئے بہت لوگ آئے بمبئی پکار رہا تھا اور کراچی روک رہا تھا ایسا لگتا ہے ایک دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا کو جارہی ہوں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہے سیفٹی بیلٹ باندھی اور کھولی بس آنکھ کھل گئی کیسی میٹھی میٹھی خواب آور تھکان ہے جیسے ایک لمبا سا خواب دیکھ کر جاگی ہوں وہ جلسے وہ مشاعرے وہ یادوں کو سجانے والی باتیں' ان کی تعبیر کب ملے گی؟ وہ تین بھائی جو پاکستان میں دفن ہیں ان سے ناطہ کیسے توڑ دوں اس مٹی میں میرے ماں جایوں کی خاک ملی ہوئی ہے۔ میرے وجود کا ایک حصہ وہاں گڑا ہوا ہے وہاں صرف ایک چھوٹا سب سے پیارا بھائی زندہ ہے اور سب سے بڑی بہن آپا ہیں جنھوں نے مجھے بغدادی قاعدہ پڑھایا تھا اور دانت مانجھنے سکھائے تھے۔ وہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہیں۔

یہاں سے وہاں تک کتنی لمبی سڑک ہے!

کتنا فاصلہ ہے!

تنہا تنہا

"اچھا رشید؟"---

"اف! توبہ کرو!"---

"نعیم؟"---

"باتسیا!---"

"مگر باپ کی ڈھیروں جائیداد---"

"مگر ڈارلنگ، میں پانچ انچ کی ہیل پہنتی ہوں۔"

"اچھا اچھا، مگر دلشاد مرزا۔ --"

"مم----" شہزاد کے گلابی ہونٹ بھیگ گئے۔ کالی کالی پتلیاں سمٹیں اور پھیل گئیں۔ ایک چلبلی شوخ لٹ نے پھسل کر بائیں گال کو چوم لیا۔ منہ زور امنگوں نے اصولوں کا ایک پل کے لئے دوران خون روک دیا۔ دلشاد مرزا کا چھ فٹ دو انچ کا قد، پانچ انچ کی ہیل کے باوجود قطب مینار کی بلندی یک طرح ذہن پر چھا گیا۔ پھر مینار نے ان گنت بانہیں پھیلا کر اس کے پگھلتے، احساس سپردگی سے مغلوب وجود کو سمیٹ کر پی لی۔ ابٹن اور تازہ پسی ہوئی مہندی کی مہک کونیاک کے ڈبل پیگ کی طرح دماغ میں چڑھ گئی۔ شہنائیوں کے سر پر ناگن مست ہو کر جھوم اٹھی۔

مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے اس مدہوش کن سمندر کی تہہ پر اونچی ایڑیوں

سے ٹھوکر ماری اور تیر کی طرح سطح پر ابھر آئی۔ اس نے چنچل لٹ کو گال پر سے نوچ کر جوڑے میں اڑس دیا۔ ہاتھ کی پشت سے رسیلے ہونٹوں کو رگڑا اور بپھرتے سمندر کو طمانچہ مار کر گرم خشک ریت پر دونوں پاؤں جما دیئے---

"کنگال!"

"ہوش میں آؤ!" فریدہ جھلا اٹھی۔ وہ کالج کی ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے آدمی کا بچہ ہونے کی قائل ہوتے ہوئے دلشاد مرزا کو تخیل میں بھی نظر بھر کے دیکھنے کا حق دار نہیں سمجھتیں۔ انہیں کالج کے طرح دار طلبہ کے جوڑے لگانے میں ہی عشق بازی کے سارے مزے مل جاتے ہیں۔ عشق دوسے کرتے ہیں اور سوز گداز یہ سہتی ہیں۔ اکثر پیغام بری کی سعادت پا کر سلگتے جھنجھناتے محبت نامے بھی رشوت میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

"تھیس مکمل کرتے ہی لکچرر ہو جائے گا۔"

لکچرر اور پھر ایک دن پروفیسر اور اگر بہت قسمت نے یاوری کی پرنسپل۔"

"یقیناً۔ دلشاد بہت پرومزنگ---"

"مگر ڈارلنگ' یہ کالج اسٹوڈنٹ لائبریری کامن روم' سالانہ جلسے' تقسیم انعامات سیمینار کانفرنسیں سچ بتاؤ' کبھی تمہارا دل نہیں چاہتا کہ ٹیسٹ بک دھڑ سے پروفیسر کے سر پر مار کر بھاگ نکلو۔ اور بہت دور جا کر پتنگ اڑانے لگو۔"

"بائی گوڈ! یو آر اے بٹ میڈ!"

"اے بٹ نہیں ڈیئر' کوائٹ اے بٹ۔"

"اچھا چھوڑو دلشاد میاں کو زیادہ حسین مرد بھی راس نہیں آتے۔ کوہ نور ہیرے کے لئے بڑے بڑے قفل کون ڈھونڈتا پھرے۔ تو اب بچا اپنا تمیز الدین' مگر تم کہتی ہو' نہایت گھوسٹ گھسا پٹا' بد تمیز نام ہے۔"

"اوپر سے شعر کہتا ہے اور پھر ترنم سے پڑھنے پر مصر۔ اک تو شاعر' اوپر سے بجتا ہوا۔"

آواز تو بری نہیں۔"

"یہی تو رونا ہے۔ اگر آواز بری ہوتی تو بھیم پلاسی میں توڑی نہ گھسیڑ پاتا۔ صاف پکڑ لیا جاتا۔"

"اونہہ! اب کلاسیکل میوزک کی بھی استاد بن گئیں۔ ہاں ہاں، معلوم ہے تم نے استاد عاشق حسین سے تعلیم لی ہے۔" فریدہ نے شہزاد کی مسکراہٹ پر چڑ کر کہا۔

"تو یوں کہو تمہیں رشید جیسا کرکٹ کا چیمپئن نعیم جیسا لکھ پتی، شہزاد مرزا جیسا بجیلا اور ---"

"منجھلی آپا کے دولہا جیسا ہنس مکھ۔" شہزاد نے لقمہ دیا۔

"اور تسنیم کے میاں جیسا جورو کا غلام، اور تلک جیسا قوم پرست، اور بھگت سنگھ جیسا جان باز اور ٹیگور جیسا ----"

"گستاخ لٹ پھر بائیں یا دائیں رخسار کو چومنے کے لئے اچھل پڑی اور شہزاد کے ہونٹوں پر پھر شہد پھوٹ آیا۔ "دیکھنے میں تو گاؤدری ہو۔ مگر دماغ کے کسی کونے میں ہے تو کچھ مسالہ!"

"اور --- اور گاما پہلوان جیسا ---"

"بس بس فل اسٹاپ کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔"

اچانک ایک پرانی، چھکڑا موٹر چنگھاڑتی احاطے میں داخل ہوئی۔ پورے گیارہ مسافر برآمد ہوئے۔ شاید اسی لئے بے چاری موٹر آہ و زاری کر رہی تھی۔ ان کے بعد ڈرائیور، یعنی دلشاد مرزا لڑکھڑاتے ہوئے برآمد ہوئے اور بونٹ پر غش کھا کر گرے۔ مگر بلبلا کر اچھل پڑے۔ بونٹ کیا پوری موٹر چنگھاڑیاں چھوڑ رہی تھی۔

اف! کیا ہنستے کھلاکھلاتے رنگوں میں ڈوبے دن تھے۔ زندگی کیا تھی۔ ایک لامتناہی کہکشاں تھی۔ دن اور رات کی قید سے آزاد۔

ان دنوں فلموں کی یہ افراط نہ تھی طلبہ فلم اسٹارز کے پیچھے دیوانے نہیں بنے تھے۔ آج کل کی مار دھاڑ اور ناچ گانوں سے بھرپور فلمیں بڑی تحقیر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ صرف نوکر چاکر ہی سلوچنا۔ بلی موریا کی فلمی تصویریں باورچی خانوں کی زینت بناتے تھے۔ نیو تھیٹر پر بھارت یا بمبئی ٹاکیز کی فلمیں ہی طلبہ کی

عنایت کی حق دار سمجھی جاتی تھیں اور نوجوان فلمی ستاروں کے پروانے نہیں تھے۔ لائبریوں، کامن روم میں سیاسی بحثیں چلتیں یا ادب اور شاعری کے چرچے ہوتے۔ انگریزی اس وقت غاصب اور ملک کے لیڈر ہر دل عزیز ہیرو تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کی آزادی کے ساتھ ساتھ بٹوارے کے سوال نے بھی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ مگر طلبہ کے ایک خاص طبقے میں بٹوارے کی ضرورت کا احساس نہیں پیدا ہوا تھا۔ آزادی اور بٹوارے کا مسئلہ کچھ مبہم سا تھا۔ ان درجن بھر لڑکیوں میں شمسہ بھی تھی اور سوشیلا بھی، کمد بھٹناگر بھی اور تمیز الدین بھی، ایلس ٹومس بھی اور دلشاد مرزا بھی شستہ اردو کے ساتھ بنے تلے پر تکلف انگریزی کے الفاظ اور جملے اس چنڈو خانے کے من چلے گروہوں کی خاص پہچان تھی۔ یہ طبقہ تعلقہ داروں عہدیداروں کے اعلیٰ انگریزی اسکولوں اور مشہور کالجوں سے نکلے ہوئے، خوش نصیب نوجوانوں کا، جن کے مستقبل روشن تھے اور آئندہ زندگی کے خواب خوش گوار۔ ان میں سب ہی کم و بیش کم تری کا شکار، جنسی بیمار، مستقبل کے دھند لکوں سے پھپھناتا۔ زہر اگلتا نوجوان پہنچ ہی نہیں پاتا تھا۔ اور اگر کسی طرح بھیس بدل کر باپ بھائی کے کسی بارسوخ وسیلے یا اپنی ذہانت کے بل بوتے پر پہنچ بھی جاتا تو وہ اپنے وجود پر کینچلی چڑھائے رہتا اور اپنی جڑ کا سراغ کسی کو نہ دیتا۔

دلشاد مرزا آگرے کے ایک اجڑے ہوئے مغل خاندان کے پون درجن بچوں میں سے پانچویں نمبر پر تھا۔ اس کے والد نواب محمود علی شیروانی کے ہاں منشی تھے۔ محلّہ پنجہ شاہی میں ایک اندھیرے گھٹے، گندی تنگ گلیوں سے گھرے نیم شکستہ مکان ان کے خاندان کے ساتھ کئی خاندان پشتم پشتم رہتے تھے۔ بڑے چار بھائیوں کو اسکول سے زیادہ پتنگ بازی اور کبڈی کے اکھاڑوں سے شوق تھا۔ تین دلشاد سے چھوٹی بہنیں قرآن مجید پڑھنے اور اردو کی شد بُد حاصل کرنے کے بعد دولہاؤں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ دلشاد مرزا کی قسمت اچھی تھی کہ نواب صاحب کے لڑکوں کی صحبت ملی اور اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اس نے نواب صاحب کی خاص توجہ حاصل کرلی۔ انہوں نے اسے علی گڑھ بھیج دیا۔ جہاں وظیفے

کے سہارے اس نے فرسٹ ڈویژن کا ریکارڈ قائم کرلیا۔ یوں اچھی گزر ہو جاتی اس کے ٹھاٹھ دیکھ کر تو اسے واقعی چچا جان یعنی نواب صاحب کا عزیز سمجھا جاتا۔

خدا سمجھے داماد کے متلاشی والدین کو۔ آگرہ، علی گڑھ سے دور نہیں۔ چنانچہ بہت جلد یہ بات کھل گئی کہ دلشاد مرزا نواب صاحب کے ایک مفلس کارندے کا لڑکا ہے۔ دلشاد ایم۔ اے اور پھر پی ایچ ڈی کرنے کے لئے لکھنؤ چلا آیا اور اپنے ماضی کو بہت دور اندھیرے میں دفن کر آیا۔ والدین کو پتہ بھی نہ تھا کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ کیوں کہ جب وہ ایف اے میں نمایاں طور پر کامیاب ہوا تب ہی اس کی خالہ اور پھوپھی میں اس پر جوتا چل گیا۔ مگر دلشاد کو اپنی دودھیال اور ننھیال میں، ہسٹریا کے دورڑے ڈالتی مرجھلی لڑکیوں سے گھن آتی تھی۔ علی گڑھ میں اس کا راز فاش ہو گیا تھا اور لکھنؤ میں اسے پناہ مل چکی تھی۔ وہ اچھا مقرر تھا۔ اخباروں میں کالم لکھ کر کما لیتا تھا۔ اس کے اتنے بہت سے آسودہ حال دوست تھے جن کے خاندان اس کی آؤ بھگت میں پیش پیش رہتے تھے۔ مہنگائی نسبتاً بڑھ گئی تھی، مگر لکھنؤ میں ٹھاٹ سے رہنا دلشاد مرزا جیسے ہونہار نوجوان کے لئے مشکل نہ تھا۔ مگر وہ عجیب بددماغ انسان تھا جس نے عشق و عاشقی کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی، بس اپنا مستقبل سنوارنے کی دھن میں لگا رہتا تھا۔

قدرت کا مسخرہ پن دیکھئے --- سخت کوششوں کے بعد بھی دلشاد مرزا خود کو شہزاد حسن کے سحر سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ کالج کے اکثر لڑکے اور نوجوان پروفیسر تک شہزاد سے متاثر تھے۔ ویسے شہزاد کے پرستاروں میں عمر کی کوئی قید نہ تھی۔ مگر دلشاد مرزا تو پہلے ان سب عاشقوں کو گدھا سمجھتا تھا پھر کیوں اس شدت سے شہزاد پر مر مٹا؟ شہزاد پلے پلائے طبقے کی پلی پلائی بورژوا لڑکی۔ انتہائی ناک چڑھی اور طرار اپنے حسن اور ذہانت پر مکمل بھروسہ رکھنے والی مغرور اور ایک جملے سے دل پھینک۔ منہ زور، پھڑکتے ہوئے مداحوں کو ٹھنڈا کرنے میں ماہر جب اکیلے میں کسی موڑ پر وہ ایک دوسرے کے سامنے آجاتے تو ساری دانائی اڑن چھو ہو جاتی۔ دیدہ دلیر شہزاد کی پلکیں بھاری ہو جاتیں۔ ایک شوخ چنچل خم دار لٹ رخسار کو چومنے لگتی

اور ہونٹ بھیگ جاتے۔ اکل کھرا، میٹر آف فیکٹ دھار دار زبان والا مرزا دلشاد احمقوں کی طرح گدی کھجاتا۔ آنکھ مسلنے لگتا، جیسے کنکر پڑ گیا ہو۔ ایک ہاتھ کو تو کسی کتاب کا سہارا مل جاتا، دوسرے ہاتھ کی بابت سمجھ میں نہ آتا کہ اس کا کیا مصرف ہے۔

ان کے دل بولتے، جسم پکارتے، مگر منہ سے بس بے معنی، روکھے ادھورے جملے ابلتے اور پھر کسی کے قہقہے یا پاؤں کی چاپ سن کر دونوں کنی کاٹ کر تیزی سے گزر جاتے، جیسے بڑے ضروری کام سے جانا ہے۔

لائبریری میں کوئی موٹی سی کتاب کھول کر شہزاد کوئی نہایت اہم چیز تلاش کرنے لگتی۔ دل کی الٹی سیدھی دھڑکن کو جی چاہتا اونچی ایڑی سے کچل دے۔ یہ جاہل۔ مسمسی، جھینپو لڑکی اس کے وجود میں کہاں چھپی بیٹھی ہے اور صرف دلشاد کی تاک میں رہتی ہے۔ اسے دیکھ کر پاؤں پھیلانے لگتی ہے اور شہزاد کے اپنے وجود کو کچلتی، ہنسی اڑاتی، ٹھنڈا پسینہ بن جاتی ہے۔ وہ شہزاد نہیں۔ کسی بیوقوف نامراد بندوشوں میں قید نادان لڑکی کا بھوت ہے، جو موقع بے موقع اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔

وہ بڑے زور شور سے کوئی چبھتا ہوا جملہ، کوئی برف کا چھینٹا، کوئی نوکیلا وار اپنے ذہن میں تعمیر کرتی۔ یہ کیا حماقت ہے! کیا وہ اسے کھا جائے گا؟ جب چنڈو خانے کے من چلے جڑتے ہیں۔ خوب پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ دھڑلے سے بیت بازیاں ہوتی ہیں تو وہ بزدل ہمزاد کہاں دبک جاتا ہے؟ دلشاد مرزا بھی اچھے بھلے ہوش مند نوجوان کی طرح جملہ بازی سے نہیں چوکتے۔ شاید انتقاماً، کچھ زیادہ ہی الجھتے ہیں۔ اور وہ بھی اس کی ہر بات کی کاٹ کرتی ہے۔

اور رومانٹک فریدہ دل ہی دل میں کڑھتی ہے۔

ہائے، کیا پیاری جوڑی ہے۔ ادھر یہ چھ ہاتھ کا مغل، ادھر یہ بوٹا سے قد کی سیدانی۔ وہ میدۂ شہاب، تو یہ پگھلا سونا سیندور کی۔ لوگو ان کا میل نہ ہوا تو دھرتی پیاسی رہ جائے گی۔

بی اے کرتے ہی شہزاد کے لئے پیغاموں کی بھرمار ہونے لگی۔ مگر شہزاد کو ایک نہ بچا۔ اس نے آرٹس کالج جوائن کرلیا۔ مصوری سے اسے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ اسکول کے کئی مقابلوں میں اس نے انعام بھی حاصل کئے تھے اور پھر جب تک شادی نہ ہو کچھ تو مشغلہ چاہیئے۔ کسی اسکول میں ٹیچری کرنے کے خیال سے ہی دم ہولا تا تھا۔

پھر مشغلہ زندگی کا اصل مقصد ثابت ہوا۔ دل میں گھٹے ہوئے پیار، نفرت، جھنجلاہٹ، روح میں چھپے ہوئے نامعلوم سے انجان جذبے کینوس پر رنگوں میں تحلیل ہوگئے۔ دو ماہ اس نے مختلف آرٹ گیلریوں، مندروں، مسجدوں، خانقاہوں، ایلورا اجنتا کی گپھاؤں، کھجور لہو کی پتھرائی ہوئی دھڑکتی زندگی سے یارانہ گانٹھا۔ گوا کے چرچ۔ جنوبی ہند کے گونجتے گرجتے گھنٹے، بمبئی کا دھواں دار سمندر۔ سمندر کی موجوں نے اس کے ننگے پیروں کو چوما اور وہ رو پڑی۔ کیوں؟ ان گنت 'کیوں' کا اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ دلشاد مرزا کیوں یاد آتا ہے؟ وہ اس کا کون ہے؟ اس سے کس جنم کا ناتا ہے؟ یا دشمنی ہے کہ اس کا خیال ایک ٹیس کے سوا کچھ نہیں۔

ملک کا بٹوارہ پرانی بات بن چکا تھا۔ دنیا بکھر چکی تھی۔ ماں کے بعد وہ اس زمین کو چھوڑ کر دوسرے ملک نہ جا سکی۔ کچھ پینٹنگز کی نمائش کے سلسلے میں فرانس جانا ہوا۔ یورپ کے درشن ہوئے۔ آرٹ گیلریوں میں کچھ سکون بھی ملا اور بے چینی بھی۔ وقت بے پاؤں رینگتا رہا۔ چونک کے وہ آئینے کے سامنے جھک گئی۔ ناممکن! شاید تکیے کے پرانے غلاف کے ڈورے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔ جلدی سے اس نے بالوں میں پھیرا۔ ڈورے قائم رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ کیلنڈر الٹا لٹکا ہے؟ 1975ء نہیں، شاید 1957ء ہے۔ ستاون!۔ یا خدا دنیا بکھرے دن برس ہوگئے! نہیں، یہ اس کی بھول ہے۔ کیلنڈر سیدھا ہی لٹکا ہے۔ تیس برس! اسے حساب لگاتے ڈر لگنے لگا۔ اس نے کب سے آئینہ نہیں دیکھا! ضرور کوئی گھپلا ہے۔

آپ ہی آپ اس کے قدم ہیر ڈریسنگ سیلون کی طرف اٹھ گئے۔ گھنٹہ بھر بعد جب وہ نکلی تو پرانے تکیے کے سفید ڈورے اس کے بالوں سے غائب ہو چکے

تھے۔ اس کا جسم اب بھی نرم، نازک اور متناسب تھا۔ بغیر عینک کے چہرے پر بے وقت کی پڑی جھریاں بھی مٹ جاتی ہیں۔

اس کے آرٹ کی ملک میں قدر بڑی تیزی سے بڑھی۔ چوٹی کے فن کاروں میں اس کا شمار ہوتا تھا اس کے فن پاروں میں دیس کا حسین اور پروقار ماضی اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر تھا اس نے رنگوں میں مندروں کی گھنٹیوں کی آواز، مسجدوں سے اٹھتی ہوئی اذان کی گونج سمو دی تھی۔ حال اور مستقبل ماضی کا نچوڑ ہیں۔ ماضی کبھی نہیں مرتا جن قوموں کا ماضی فنا ہو جائے، ان کا حال اور مستقبل مہمل اور بوکھلائے رہتے ہیں۔

ماضی زندہ ہے۔ بالوں میں الجھے ہوئے پرانے تکیے کے ڈورے غائب ہو گئے۔ ماضی لوٹ آیا۔ ماضی ہر زندہ شے میں رچا بسا ہے۔

"بی بی، دو کوڑی کا لیکچرر! مائی گاڈ! منجھلی خالہ نے دلشاد مرزا کے بارے میں اڑائی خبریں سن کر کہا تھا۔

اور پھر نعیم۔ احمد جمال آئی سی ایس ----- انوار الحق تعلقہ دار۔ ہاں ذرا عمر زیادہ ہے مگر بے حد اسمارٹ۔ جاوید زیدی۔ سب کے سب کھرے سید، پوتڑوں کے رئیس۔ مگر اسے ایک بھی پھوٹی آنکھ نہ بھایا۔

نعیم ٹھنگنا۔

احمد جمال کالے بھٹ، الٹا توا۔ بھاری ہے تو کیا ہوا۔؟"

انوار الحق کو تو سارے خاندان کی مخالفت حاصل تھی۔ پندرہ بیس سال کا فرق تھا عمر میں۔

رہے جاوید زیدی تو نہایت دقیانوسی خاندان۔ ابھی عورتوں نے پردہ بھی نہیں چھوڑا۔ سوسائٹی موو کرنے کا تو سوال چھوڑ دو۔

اور دلشاد مرزا۔

لیکچرر شپ تو مل گئی تھی علی گڑھ میں، مگر کیو بہت لمبا تھا، اس لئے 1953ء میں ہی پاکستان چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ قدم جمتے نہ دکھائی دیئے تو انگلینڈ چلا گیا۔ جانے

والے کیا لوٹ کر آتے ہیں؟

نہیں، اب تو لٹ کو رخسار چومنے کا بھی شوق نہیں رہا۔ نہ دلشاد مرزا کے خیال سے پلکیں بوجھل ہوتی ہیں مگر دل میں ٹیس تو اٹھتی ہے۔ خدا کا شکر کہ دل زندہ ہے۔ مرجاتا تو کسی کا کیا کرلیتی؟ دل کی ٹیسوں کو ہی اس نے رنگوں میں ڈبو دیا تھا۔ وہ ٹیسیں جب اس نے ڈسٹ بن سے سیب کے چھلکے کھاتے بچوں کو دیکھا تھا اور چوپاٹی پر چاٹ کے جھوٹے پتے چاٹتے ننھے بچوں کی آنکھوں میں بھوک دیکھی تھی۔ فارس روڈ پر سلاخوں کے پیچھے گیارہ برس کی بچی کو گاہک کے لبھانے کے لئے جالی کا کرتہ پہنے پوڈر لپسٹک تھوپے دیکھا تھا۔ جالی کے کرتے میں سے اس کی مٹر برابر چھاتیاں جھلک رہی تھیں۔ اس نے اس ماں کو بھی دیکھا تھا جو اپنے بچوں کو ناکافی بھیک مانگ کر لانے پر اس کو پیٹ رہی تھی۔

"کیوں مار رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بڑا حرامی ہے یہ بچہ لوگ میم صاحب۔ دن بھر ادھر ادھر کھیلتا ہے اور اکھا پیسہ چاٹ مصالحہ میں کھا جاتا ہے۔" وہ پورے دنوں سے تھی اور بری طرح ہانپ رہی تھی۔

"تم ان سے بھیک منگواتی ہو؟"

"اور کیا کرے میم صاحب؟"

"ان کا باپ کہاں ہے؟

"بھاگ گیا ایک ہلکٹ کے سنگ۔"

اس نے رخسار پر گری ہوئی لٹ کو واپس نہیں اڑسا، کیونکہ وہ دھیرے دھیرے اسے ڈس رہی تھی۔ شوجی نے جب دھرتی کے نصیب کا زہر پی لیا تھا تو ان کا کنٹھ نیلا پڑ گیا تھا۔ مگر اس کا گال نیلا نہ ہو پایا۔ سارا زہر دل میں اتر گیا جو اس نے کینوس پر انڈیل دیا۔

"تو یہ ہے ممتا۔" اس نے برش کو نیلے رنگ میں ڈبوتے ہوئے سوچا۔ "کہتے ہیں جب عورت گربھ دتی ہوتی ہے تو اس کا انگ انگ کندن کی طرح دمکنے لگتا

ہے۔! مگر کبھی گربھ کینسر بھی ثابت ہوتا ہے، لیکن جس نے مرد کے جسم کو نہ جانا، وہ کیا جانے گربھ دتی کا دکھ سکھ۔ شہزاد ایک بنجر جزیرہ تھی۔ جہاں کونپل پھوٹنے کا بھی خطرہ نہ تھا۔ لوگوں کی نگاہوں میں   کی پرچھائیاں دیکھ کر وہ سہم جاتی۔

وقت کے زلیلے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"میں --- شہزاد حسن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کا نام؟"

"دلشاد مرزا۔"

وہ پتھر کی مورتی بن گئی۔

"ہلو ---- ہلو"۔ ادھر سے آواز آئی۔

"میں شہزاد بول رہی ہوں۔" اسے حیرت تھی کہ اس کی آواز میں لرزش کیوں نہیں تھی۔

"او ہو! آداب عرض!"

"آداب عرض۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" میں یہاں ہوں۔

"انگلینڈ سات سمندر پار سہی۔ مگر اسی کرہ ارض پر ہے۔ اور آپ کی شہرت دیکھتے ہوئے اب تو مجھ جیسے جاہل مطلق بھی ایسے گئے گزرے نہیں کہ ----"

"اچھا، تو نشانہ بازی کی مشق جاری ہے"۔

"آپ کی دعا سے اپنی ٹولی کے کئی افراد یہاں تلاش معاش کی خاطر جلوہ افروز ہیں۔"

"خوب! ---"

اچھا یہ بتایئے، آپ سے ملاقات کا وقت لینے کے لئے آپ کے سیکرٹری سے بات کرنا ہوگی؟"،

"ارے، آپ نہ جانے کس مغالطے میں پڑے ہیں۔ میں اتنی توپ ہستی ہرگز نہیں ہوں جو سیکرٹری وغیرہ رکھوں۔"

"آپ سے کس وقت ملا جا سکتا ہے؟"

"جو شبھ گھڑی آپ کو سوٹ کرے۔"

"یعنی کہ ابھی --- اسی وقت؟"

"قطعی ---"

"وہ --- میرا مطلب ہے میرے ساتھ بیوی بھی ہوگی۔"

قطب بنا کر کنت باہیں نمکولیوں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ مگر اس نے جلدی سے کہا ضروری ---- بھی ---"

"بچے تو ہیں"

"مطلب ساتھ نہیں آئے؟"

"ہوتے ہی نہیں تو ساتھ کیسے آسکتے تھے؟"

"اوہ! سوری!"

"کوئی بات نہیں، اچھا تو ہم آتے ہیں۔"

تھوڑی دیر تو وہ ٹیلی فون کا خاموش رسیور تھامے پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی رہی۔ پھر جیسے ایک دم آذرِ کائنات نے تکمیل سے غیر مطمئن ہو کر چھینی پر ہتھوڑا دے مارا۔

کمرہ گودڑ ہو رہا تھا۔ رنگوں کے ٹیوب برش، کشن۔ رات کے اتارے ہوئے کپڑے چائے کی پیالی۔ اس نے جلدی جلدی لیپا پوتی شروع کی۔ کوڑا جو سمٹ سکا۔ اٹھا کر دوسرے کمرے میں پٹخا۔ پہلے اودی کانجی ورم کی ساڑھی نکالی۔ بڑی مردہ سی لگی۔ پھر طاؤ سی تن چھوئی کو ٹٹوتا۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گی۔ نہ جانے دل کا کون سا کونا پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ دلشاد مرزا کو اس پر ترس کھانے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اکڑتا ہوا اپنی کامیاب زندگی کا ڈھنڈورا بنا آئے گا۔ مجھ اکیلی پر ترس کھائے گا۔ ہشت! میں -----"

گھنٹی بجنے پر اس نے ایک بار آئینے پر نظر ڈالی۔ ہلکی لپ اسٹک اور مسکارا سے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔

دروازہ کھول کر وہ پھر پتھر کی مورتی میں جمنے لگی۔

سوکھا، چرخ لمبا تاڑ سا، بالک گنجا ایک مریل سا انگریزی مصنوعی دانت نکوسے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک منی سی بڑھیاں کھڑی تھی جو مشکل سے اس کی کمر سے ذرا اونچی ہوگی۔ حالانکہ وہ ہائی ہیل پہنے ہوئے تھی۔

"دلشاد مرزا اور سلویہ میری بیوی۔" باتیں انگریزی میں ہوئیں۔

"شہزاد ---- آیئے آیئے۔"

"یہ تو اب بھی حسین ہے!" سلویہ نے میاں سے کہا۔ وہ ان سے چند سال بڑی ہوگی۔

تھوڑی دیر سناٹا چھایا رہا۔

"یا خدا، کیا اب بھی زبانیں بند رہیں گی۔ صرف دل دھڑکیں گے۔" شہزاد نے سوچا۔ مگر اس کا دل نہ دھڑکا، نہ اچھلا۔

مجھے السر کے مرض نے پریشان کر ڈالا۔ دراصل میری اور سلویہ کی ملاقات اور شادی بھی پیٹ کی السر کی وجہ سے ہوئی۔ ہم دونوں ایک ہی ڈاکٹر کے زیر علاج تھے۔ پھر ملاقاتیں بڑھیں۔ سلویہ کا مرض مجھ سے بھی پرانا تھا اس کی رائے پر عمل کر کے مجھے بہت فائدہ ہوا۔

"ڈلی انتہائی بے پروا انسان ہیں۔ شراب نے انہیں تباہ کر ڈالا تھا۔"

"سلویہ نے مجھے نئی زندگی دی۔"

"آپ کی شادی ---"

"ہماری شادی کو یہ چوتھا سال چل رہا ہے۔ اکتوبر میں پورے چار سال ہو جائیں گے۔"

"ڈلی کو تم سے پیار تھا۔" سلویا شرارت سے مسکرائی اور چائے بنانے لگی۔

"پلیز سلوی۔" دلشاد مرزا کے زرد چہرے پر نیلاہٹ جھلکنے لگی۔

"نان سنس! مس حسن کیا تمہیں بھی ان سے پیار تھا؟"

"سلوی!"

"ہمارے ہاں عورت محبت کا اقرار کرے تو بے حیا سمجھی جاتی ہے۔" شہزاد نے مذاق میں بات ٹالنا چاہی۔

"مگر ضرور تمہیں ان سے محبت ہوگی۔ ناممکن ہے کہ ڈلی نے یک طرفہ محبت کی ہو اور اس شدت سے کی ہو۔ امپوسبل۔"

"ان باتوں سے فائدہ؟" دلشاد مرزا نے صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"ہاؤ سلی۔ پھر تم دونوں نے شادی کیوں نہیں کی؟ پرانے خیالات کے بزرگوں کے دباؤ سے مجبور ہوگئے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر؟"

"آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔"

"کیوں؟"

"بڑی مشکل سی بات ہے ہم ہندوستانی لڑکیاں آزاد بھی ہیں اور محبوس بھی۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارے روشن خیال بزرگ ہمیں جیون ساتھی کے چناؤ کی پوری آزادی بھی دیتے ہیں پھر بڑی نرمی اور ہوشیاری سے ہمارے انتخاب کے بارے میں دل میں شبہ ڈال دیتے ہیں۔"

انتہائی ظلم، غیر انسانی حرکت!" سلویا بھنائی۔

"مگر انہیں مجرم نہیں قرار دیا جاسکتا۔"

"کیوں کہ وہ بہت چالاک ہیں؟"

"نہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں، ہماری بہتری سمجھ کر کرتے ہیں۔"

"سلویا، کس قدر حماقت ہے ہم تینوں نے والدین کو بھگتنا ہے، مگر اولاد کے

بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس لئے یہ بحث فضول ہے۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

"اچھا' یہ اتنے دن بعد ہندوستان کس سلسلے میں آنا ہوا۔" شہزاد نے موضوع بدلا۔

"وطن کی یاد کھینچ لائی۔"

"مگر آپ تو پاکستان چلے گئے تھے۔"

"پاکستان بھی میرا وطن ہے۔ وہاں تو سال دو سال بعد جانا ہوتا رہا۔"

"اور ہندوستان۔"

ہندوستان میرا آبائی وطن ہے' جہاں میں پیدا ہوا۔ جہاں میرے جدِّ امجد دفن ہیں۔ جس مٹی میں میں کھیل کود کر بڑا ہوا۔ جمنا کے پانی کو بھول سکتا ہوں۔ جہاں میں نے تیرنا شروع کیا۔ وہ آگرے کی پیچ در پیچ گلیاں۔ محرم کے تعزیے' ہولی کے رنگین جلوے' دیوالی کی جگمگاتی فضا۔ یوں تو میں برطانوی باشندہ ہوں۔ تو کیا انار کلی کی گہما گہمی' کراچی کی زندگی سے بھرپور محفلیں' علمی اور ادبی جلسے ہا کس بے' سینڈز پٹ' پکنک پارٹیاں' فیض احمد فیض' مہدی حسن' میرے اپنے نہیں؟ سوچتا ہوں تو ساری دنیا اپنی ہی لگتی ہے۔"

پھر عجیب اداس سی خاموشی چھا گئی۔ ڈسنے والی تنہائی۔

"اور اب"۔ دلشاد مرزا نے کہا۔ "عمر کا تقریباً نصف حصہ انگلستان میں گزارنے کے بعد وہ بھی تیسرا وطن ہوگیا ہے۔ وہاں میری پیٹ کی بیماری قابو میں رہتی ہے۔ مجھے اس زندگی کی ایسی عادت ہوگئی ہے کہ کہیں جی نہیں لگتا۔ کیا وہ جو ایران' توران اور عربستان سے ہجرت کر گئے۔ صدیوں کے بعد بھی اپنے آبائی وطن کو بھول سکے ہیں؟ کیا ہمیں ان لوگوں سے دلی لگاؤ نہیں ہے' جو ہم نے ورثے میں اپنے بزرگوں سے پایا ہے۔ مجھ ان تینوں وطنوں سے پیار ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک ملک سے پیار کر کے دوسرے ملک سے غداری کر رہا ہوں۔ کتنے لوگ ہندوستان اور پاکستان سے دوسرے ملکوں میں جا بسے۔ وہاں سے نکالے گئے تو جہاں

سینگ سمایا وہاں جا بسے۔ مجھے ایسے لوگ ملے جو خود کو ہندوستانی کہتے ہیں اور افریقہ جہاں سے نکالے گئے ہیں' اس کی یاد میں روتے ہیں اور انگلستان میں آکر بسنے کے بعد وہاں کے عادی ہو گئے ہیں۔"

"جیسے صدیوں سے ہندوستان میں بسے ہوئے چینی خود کو چینی ہی مانتے ہیں۔ چین سے جنگ بھی ہوئی وہ غدار نہیں ثابت ہوئے۔ وہ چاہیں بھی تو اپنے آبائی وطن نہیں جاسکتے یہاں بمبئی میں صدیوں کے بسے ہوئے ایرانی اپنے آبائی ملک کو نہیں بھولے' مگر ہندوستان کی سلامتی ان کی سلامتی ہے۔"

"اف' بڑی بور باتیں کر رہے ہو تم لوگ تمہارے جواب سے مجھے تسلی نہیں ہوئی۔" سلوی بگڑ اٹھی۔

"کس جواب سے؟ شہزاد نے پوچھا۔

"کہ والدین زبردستی نہیں کرتے پھر بھی تم لوگ اپنے پیار کا گلا گھونٹ لیتے ہو۔ تم دونوں بھاگ کیوں نہیں گئے؟"

"کیا بے رحم بیوی ہے کہ شوہر کو بھگوانے پر مصر ہے۔"

"اس وقت میں تمہاری بیوی تھوڑی تھی۔ تم بھاگ جاتے تو مجھے تو خبر بھی نہ ہوتی۔" سلوی بولی۔

"کیا آپ کے ملک میں جو لڑکیاں والدین کی مرضی کے خلاف بھاگ کر شادی کرلیتی ہیں۔ وہ کامیاب زندگی گزارتی ہیں؟"

"اوہ مائی لوڈ نو۔ بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ کوئی گارنٹی نہیں۔"

"یہ کہی اب تم نے سمجھ کی بات۔" دلشاد ہنسے۔ "والدین جبرا. شادی کردیں اور ناکام ہو تو والدین مجرم' اور اولاد اپنی مرضی سے کرے' تو والدین کہتے ہیں دیکھا ہمارا کہا مانتے تو سکھ چین سے رہتے۔"

سلوی ضد کر کے چائے بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور دلشاد مرزا اور شہزاد پھر مجرموں کی طرح گم صم بیٹھے رہے۔

"فار گوڈ سیک' کچھ باتیں کرو شرماؤ نہیں۔ میں کچھ نہیں سن رہی ہوں۔"

سلوی نے کچن سے ہانک لگائی-
ایک دم دلشاد نے غور سے شہزاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کرخت آواز میں کہا میں نے تمہاری محبت میں زندگی کو تماشا بنا ڈالا- خدارا ایک بار اب تو کہہ دو کہ میں احمق نہیں تھا- میرا جنون یک طرفہ نہیں تھا- تھوڑی سی آنچ تم تک بھی پہنچی تھی-"
"ایک اقبال جرم سے ہی جرم ثابت ہو گا-" شہزاد کی پلکیں بھاری ہو گئیں- شریر چلبلی لٹ مچل کر دائیں یا بائیں رخسار کو چومنے لگی اور نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد ہونٹ کانپ کر نم ہو گئے ایسا لگا' اس کے بالوں کی لٹ نہیں دلشاد مرزا کے ہونٹ ہیں- اس نے لٹ جوڑے میں نہیں اڑسی-
"مگر بخدا زندگی کا ہر لحہ تمہارے تصور سے رنگین رہا- سوز و ساز سے پر-"
"جو شاید دوسری صورت میں نہ رہ پاتا-
"اور جو تم بیزار ہوتے اب تک تو طلاق ہو چکی ہوتی-" سلوی نے چائے کی ٹرے لاتے ہوئے کہا- "سوری' میں سب سن رہی تھی اتنی اردو سمجھ لیتی ہوں-"
"اچھا سلوی' آپ نے اتنی دیر میں شادی کیوں کی؟"
"کیا تم ہندوستان سمجھتے ہو تم ہی عشق کرنے کا سلیقہ جانتے ہو-"
"مطلب؟"
"مطلب یہ کہ میرا منگیتر فیکٹری کے حادثے میں مر گیا-
اور آپ نے اس کی یاد میں زندگی کے بہترین لمحے تنہائی کی بھینٹ چڑھا دیئے-"
"لو بھئی چھلنی بھی بولی کہ چولہے کا منہ کالا- مائی ڈیئر' تم نے مجھ سے کم حماقت نہیں کی- تینوں جی کھول کے ہنسے-
"ہم کتنے احمق ہیں-"
"پھر بھی زندہ ہیں-" "دراصل ہمارے دل زندہ ہیں-" شہزاد چہکی-
"اچھا شہزاد' مجھے سلوی سے بڑا پیار ہے- اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ

سکتا۔ تمہیں اعتراض تو نہیں؟"

"توبہ! شہزاد بوکھلا گئی۔ "اچھا' میں کہوں مجھے بھی سلوی پسند آئی' تو آپ کو کچھ اعتراض ہے؟"

ان دونوں کے جانے کے بعد بھی شہزاد پر ایک عجیب سا نشہ طاری رہا۔

"کیا اولاد صرف رحم میں پروان چڑھتی ہے؟ دل اور دماغ میں بھوسا بھرا رہتا ہے؟ آج میرا دل اور دماغ نئے جذبے سے "حاملہ" ہو رہا ہے۔ یہ میرے بچے جن سے میرے قدردانوں کی بھی محبت وابستہ ہے۔ کیا میری اولاد نہیں۔ اس کی بنی ادھ بنی پینٹنگز کو پیار سے نہارا۔

"کیا میں اکیلی ہوں؟ سات سمندر پار سہی' مگر مجھے کوئی دل میں بسائے جی رہا تھا۔ میں نے جب چاہا ہے اس کی بانہوں میں پناہ لے لی ہے۔ میری آذری' میری قید' میری اپنی تمنا ہے۔ میری اپنی آرزو ہے' میرے اپنے بس میں ہے۔ اور پھر جن کمروں میں میری پینٹنگز سجی ہوئی ہیں ان سے بھی تو میرا ایک ناتا ہے۔ یہ بلند و بالا مندر' صنم خانے' سپنار سڑک پر کھیلتے بچے' ہوا میں اڑتے پرندے' ہرے بھرے کھیت' آہیں اور قہقہے دور بجلی' ریل کی سیٹی۔ ان سب کو میں نے اپنے برش میں قید کر کے کینوس پر سجا دیا۔

کیا میں اکیلی ہوں؟ پگلی شہزاد حسن' جواب دو۔!"

"اور یکایک کمرہ ابٹن اور تازہ پسی مہندی کی مہک سے بھر گیا اور شہنائیاں سہاگ کے گیت گنگنانے لگیں۔

دور کوئی ننھا سا بچہ کلکاری مار کر ہنسا۔ آسمان پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ شہزاد نے برش سنبھالا اور نارنجی رنگ کی پیالی میں ڈبو دیا۔
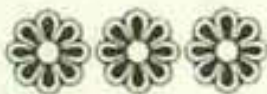
میں چپ رہا

اسٹیشن پر گاڑی ٹھہرتی اور معلوم ہوتا اب نہ ہلے گی۔ حالاں کہ ہلتے ہلتے بھی جوڑ دکھنے لگے تھے۔ اجمیر کا سفر اور وہ بھی عرس سے ایک مہینہ پہلے اور پھر سیکنڈ کلاس میں سفر، بچائے ہوئے روپے ناک کے رستے نکل رہے تھے۔

دونوں آمنے سامنے کھڑکی کے قریب کی سیٹوں پر بیٹھی کٹور دان کھولے پراٹھوں اور آلو کی ترکاری پر جٹی ہوئی تھیں۔ ان کی باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ دونوں پڑوسنیں ہیں۔ اجمیر شریف سے منت پوری کر کے آرہی ہیں۔ دھلی منجھی میٹھی اردو سن کر ہم بمبئی نواسوں کے کان کھاڑے ہو جاتے ہیں۔ قرآت (قرآن پڑھنے کا طریقہ) کا سا سرور چھا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نپے تلے جملے، ادھورے سے پر بجیلے جملے جو معنی کے لحاظ سے اتنے بھرپور اور سریلے جیسے مہدی حسن کی غزل۔

"تو یہ زبان ابھی زندہ ہے!" میں نے سوچا۔

کھانا کھا کر دونوں نے کھڑکی کے باہر ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھ لئے۔

میری سیٹ راہداری میں تھی۔ سامنے بیٹھا ہوا مسافر اوپر چلا گیا تو میں نے بستر بچھا لیا اور اونگھنے کا پروگرام بنانے لگی، مگر میرے کان رس کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ اچھلتے ہوئے جملے شربت کے چھینٹوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ ڈائجسٹ میں دیئے چٹکلوں پر نظریں تھیں مگر کان ادھر ہی لگے تھے۔

مگر ایک دم چھینٹ کے غرارے والی بیوی اونچی آواز سے پھٹ پڑیں۔
خدا کی مار مہنگائی ہی مہنگائی ہے ایک ہمارا زمانہ تھا۔ اماں روز سب بچوں کو دو دو پیسے دیتی تھیں، کون ناشتے کا جھول* پالے۔ ایک پیسے کی تو ہم دونا بھر گرم گرم جلیبیاں لیتے اور ایک پیسے کی سیتارام سے چار اروی دال کی پیٹی بھری کچوریاں اور تتیا مرچ کی چٹنی۔ اللہ قسم پیسے کی چار کچوریاں آیا کرتیں تھیں۔
"چار کچوریاں؟ تم کھا جاتی تھیں؟"
چھوٹی چھوٹی ہوا کرتیں تھیں۔ انہوں نے انگوٹھے اور کلمے کی انگلی کا چھلا بنا کر ناپ بتائی۔
"اور بہن میری تین آنے سیر بکری کا گوشت۔"
"اب تو صدیق میاں چھ روپے سیر بڑے کے بچھڑے کتوں کے لئے منگاتے ہیں جن میں آدھی ہڈیاں۔"
پھر دونوں کسی نئی شادی میں دیئے گئے جہیز کا رونا رونے لگیں۔ صدیق میاں نے کیا جہیز دیا ہے۔ حیدر آباد کا لڑکا تھا' وہاں دولہا کو "گھوڑے جوڑے" کے نام سے بھرنا پڑتا ہے۔ ہندوؤں میں اس رسم کو جہیز کہتے ہیں۔
پھر دونوں کچھ دھیمی آواز میں راز کی باتیں کرنے لگے۔ برتنوں کے کارخانے اور سستے مزدوروں کی مراد آباد میں بڑی غربت ہے۔ مسلمان تو کوڑی کے تین ملتے ہیں۔ پانچ پانچ برس کے بچے صبح سے شام تک جٹے رہتے ہیں۔ انہیں روزگار جو نہیں نصیب' پھر نہ جانے ان کی سہیلی نے کیا کہا کہ زور سے بنکاریں۔
"توبہ میرے خدا۔!"
"اونہہ تم تو نری پاگل ہو۔"
"ہاں' جب ہی تو اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔"
ارے بھئی اقلیتوں کے لئے کمیشن بیٹھ گیا ہے اور ---"
تاریخ گواہ ہے کہ کمیشن بیٹھتے ہیں' اٹھتے نہیں اور ہمیشہ اقلیتوں کے سوال حل کرنے کے لئے ہی بیٹھتے ہیں۔ خدا سمجھے ان اقلیتوں سے۔"

"مجھے تو نہیں یاد کہ ہسٹری میں ایک بھی کمیشن بیٹھا ہو یا بٹھایا گیا ہو۔"

"ہاں یہ کمیشنوں کا فیشن تو بس ادھر دو سال سے ہی چلا ہے۔ خدا کی مار بس ہر مرض کی دوا یہ نامراد کمیشن ہیں۔ اندرا گاندھی پر بھی بیٹھا تھا، شاید اب بھی بیٹھا ہے۔ مختلف کمیشنوں کے گھپلے میں کچھ سمجھ میں نہی آتا کہ اس والے کمیشن کا کیا ہوا۔ بیٹھا ہے کہ۔ اونہہ لعنت بھیجو۔ اچھی یہ تو بتاؤ یہ کمیشن بیٹھتا کیسے ہے۔"

تو یہ بیوی نری گائے کا کھونٹا ہو۔ بھئی چند بڑے لوگوں کو چن کر بٹھا دیا جاتا ہے۔"

"کہاں!"

"اے کسی ہال وال میں بٹھایا جاتا ہو گا۔ تم تو خواہ مخواہ بال کی کھال نکالتی ہو۔ اب پوچھو گی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں کہ اسٹولوں پر؟"

چاندنی قالین پر بھی تو بیٹھ سکتے ہیں۔"

"ذمہ داری کے کام گدوں تکیوں پر بیٹھ کر نہیں کئے جاتے۔ یہ بھی کوئی مشتری جان کا مجرا ہے کہ نواب زادے گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں اور ---"

"اے برسوں مہینوں کرسیوں پہ ٹنگے ٹنگے تختہ ہو جاتے ہوں گے کمیشن والے بے چارے۔"

"تو کیا دن رات کمیشن پر ہی بیٹھے رہتے ہیں؟ چلنا پھرنا لنچ بریک چائے پانی کچھ ٹہل ہو ہی جاتی ہو گی۔"

"پر بے چاروں کا دم بولا جاتا ہو گا۔ ٹھالو قسم کے لوگ ہوں گے۔"

"نہیں جی بڑے بڑے نکتہ داں مقرر کئے جاتے ہیں، سمجھ دار لوگ جو تمام مسائل سے واقف ہوں" "پنشن یافتہ ہوتے ہوں گے۔"

"ضروری نہیں۔"

"اے تو اپنا کام دھندا چھوڑ کے آن بیٹھتے ہیں کمیشنوں پر' توبہ!"

"کام دھندا کیوں چھوڑتے ہوں گے۔"

"تو ڈبل ڈیوٹی کرتے ہیں نگوڑے' یہ تو سراسر اندھیر ہے بھئی' میرے خیال

میں تو کسی کو ضرور احتجاج کرنا پڑے گا--- اے ہے نہیں' ایک اور مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور نیا کمیشن بٹھانا پڑے گا- مگر ڈبل ڈیوٹی----"

"تو کچھ اوپر سے ملتا ہوگا' جی مفت کوئی نہیں اٹھتا بیٹھتا-"

"یوں کہو' ڈبل ڈیوٹی کا کچھ تو ملتا ہوگا-"

"سرکار بے گار تو ہرگز نہ لیتی ہوئی-"

"کسی اخبار میں کچھ تھا تو کہ ایک ایک کمیشن پر لاکھوں خرچ ہوتے ہیں-"

"اچھا تو کمیشن میں بیٹھنے کے الگ سے پیسے ملتے ہیں-"

"جو نہ ملتے تو مفت میں کسی کی مت ماری گئی ہے جو ان نگوڑے کمیشنوں میں بھیجا کھپانے بیٹھے- اب جو یہ اقلیتوں پر کمیشن بیٹھا ہے تو----"

"اے بی کہو گی تو کہ موئی گائے کا کھونٹا ہوں یہ اقلیتیں کیا ہوتی ہیں؟"

"اقلیت نکلا ہے قلت سے' یعنی کمی ---- جو تعداد میں کم ہوں' مائنارٹی-"

"اچھا تو یوں کہو' تھوڑے سے لوگوں پر بیٹھا ہے کمیشن--"

"اور کیا-"

"پر کیوں؟"

اس لئے کہ ان کی حق تلفی ہو رہی ہے' ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے' انہیں روزگار نہیں' غربت' بیماری جہالت---"

اے بیوی تم ہوش میں تو ہو' اے یہ کون گلی کی ہانکنے لگیں- ابھی تو یہ کہہ رہی تھیں کہ قلت یعنی کمی' جن کی تعداد کم ہو-"

ہاں' جیسے ہری جن' مسلمان' عیسائی' پارسی' سکھ' آدی باسی---"

سنا ہے ہری جن تو بھرے پڑے ہیں اور آدی باسی بھی کروڑوں ہیں- مسلمان بھی کروڑوں ہیں- بہت کم گئے پاکستان' ہندوستان سے ہجرت کر کے جانے والوں کو وہاں مہاجر کہتے ہیں- پاکستان کے اصلی باشندوں کے مقابلے میں مہاجر تو بہت کم ہیں- اکثریت تو یہیں رہ گئی- پھر ان پر قلت کہاں سے پڑ گئی-"

"ایں؟"

"اے بی اقلیت تو لیڈروں' لکھ پتیوں' کروڑ پتیوں اور فلم سٹاروں کی ہے' بتاؤ ہے کہ نہیں؟"

"ویسے اقلیت تو انہی کی ہے مگر ان اقلیتوں کا جن کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہو رہی ہے جو بے روزگاری' جہالت' بیماری کا شکار ہیں اور...."

"ان کی تو اکثریت ہے اور تم کہہ رہی ہو کمیشن اقلیتوں پر بیٹھا ہے۔"

"اے بھئی کچھ جانو نہ بوجھو اپنی ہانکتے کھلی جاتی ہو۔"

"اور تم بھی تو جوتیوں شمیت کاجل بنی جاتی ہو۔"

"اخبار میں تو...."

"اے ان اخباروں کی بھلی چلائی نرا سفید جھوٹ یا تم نے غلط پڑھ لیا ہو گا۔"

"غلط کا ہے کو پڑھتی' منا نے پڑھ کے بتایا کہ مانیورٹی پر کمیشن بیٹھ رہا ہے اور...."

"اے دفان کرو' اچھا چلو مان لیا کہ ملک میں اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے اور اکثریت کروڑ پتیوں کی ہے' اب آگے چلو۔"

"آگے کیا چلوں' کم بخت اسٹیشن آئے تو برف لوں' حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔"

اے ہے ایسا بھی کیا تکلف' یہ تھرماس اتارو نا ذرا۔" دونوں سے ٹھنڈا پانی پی کر ڈبیاں کھول کر پان منہ میں رکھے اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں۔

ایسا معلوم ہوا کہ ایک دم فلم ٹوٹ گئی اور ٹی وی کے اسکرین پر لکھا ہے "چھما کیجئے۔" میرا دم گھٹنے لگا۔ اتنی پیاری باتوں پر تھرماس کا پانی پڑ گیا۔ دیکھنے میں وہ نیلے پاجامے اور سفید کرتے دوپٹے والی بیوی قطعی گھریلو قسم کی لگ رہی تھیں مگر باتوں میں بار بار پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ دونوں تھوڑی بہت پڑھی لکھی لگ رہی تھیں۔ تعلیم اردو ہی کی سہی مگر جاہل کبڈ نہیں تھیں۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی

بول رہی تھیں۔

ویسے تو قلی بھی خاصا پالی ٹیشن لگ رہا تھا۔ مجھے فکر کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے اور وہ جنتا سرکار کا رونا رو رہا تھا۔

"تو کیوں دیا تھا ووٹ؟"

"بس جی سب دے رہے تھے ہم نے بھی دے دیا۔ ٹرک میں لے گئے تھے اور پھر ووٹ تو دینا ہی پڑتا ہے۔"

"کیوں؟"

چھٹی تو دینی ہی پڑتی ہے جی۔"

"کیوں؟ مت ڈالو' پھاڑ کے پھینک دو' پیسے لے لو اور ووٹ مت ڈالو۔"

"پکڑ لیتے ہیں جی' کہتے ہیں نمبر پڑا ہوتا ہے' جو نہ ڈالے وہ صاف پکڑ لیا جاتا ہے۔"

"نہیں' کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

"یہی کہتے ہیں' کیا معلوم؟

"اچھا چلو پکڑ لیں گے تو کیا کر لیں گے؟"

"کون جانے سر پھوڑ دیں' گھربار جلا دیں' بیوی بچوں کا خون خرابہ کر دیں۔

"کون ہیں وہ لوگ؟"

"کیا معلوم' تگڑے تگڑے سفید جھک کپڑوں والے بڑے آدمیوں کے لئے ووٹ لینے والے آتے ہیں' محلے محلے جاتے ہیں۔"

اچھا روپیہ نہ لو تو۔"

"تو بھی دھمکاتے ہیں۔ ہم سے کہا تھا یہ ہو گا وہ ہو گا' رام راج آ جائے گا۔ گاندھی جی کا سپنا پورا ہو گا۔ آزادی ملے گی۔"

کاہے کی آزادی؟"

"اخباروں کی' دکھ درد منانے کی۔"

"اخبار پڑھتے ہو؟"

"نئیں جی پڑھنا آتا تو یہ بوجھا کاہے کو ڈھوتے۔"

"دکھ درد سنایا؟"

کسے سنائیں' نیتا کے بنگلے پر بندوقچی کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی موٹر میں دندناتے نکل جاتے ہیں۔ جلسے میں ہم تو میل بھر سے ان کا بھاشن سنتے ہیں۔ شکل بھی نہیں پہچان پڑتی سب ایک ہی سٹری کے لگتے ہیں۔"

"بال بچے ہیں؟"

"گاؤں میں ہیں' ایک تو کسی کرم کا نہیں' ہاتھ پیر سے لاچار ہے' ایک بمبئی بھاگ گیا وہ...." ایک دم چپ ہو گیا۔

"بمبئی میں کیا کرتا ہے؟"

"کھوٹا کام کرتا ہے باقی۔ اب چھوٹے کے پر بھی نکل رہے ہیں' اڑ جائے گا کوئی دن۔"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ بمبئی سے ہی آ رہی ہوں۔ وہاں کھوٹے کام کی بڑی کھپت ہے۔

نیلے غرارے والی بیوی پھر قلت اور افراط کے سوال سے جوجھ رہی تھیں۔

"اقلیت تو زر داروں کی ہے۔ انہیں کا راج ہے۔ یہ کمیشن انہیں کیلئے بیٹھا ہے سستی مزدوری' زیادہ منافع' ایکسپورٹ امپورٹ کی سہولتیں' اونچی سے اونچی عمارتوں کے ٹھیکے حکومت بنتی بھی انہیں کے پیسے سے ہے۔"

"پھر آپس میں جھگڑے کیوں ہو رہے ہیں؟"

"جب لاش پر گدھ جھپٹتے ہیں تو بڑا حصہ ہتھیانے کیلئے ایک دوسرے کو بھی کھسوٹ ڈالتے ہیں۔ جس کی لاٹھی زیادہ لمبی اسی کے قبضہ میں بھینس۔"

"اگر صلح صفائی سے مل کر بانٹ کر کھائیں تو۔"

"بات یہ ہے کہ ملک ترقی کر رہا ہے' صنعت بڑھ رہی ہے' نئے نئے کارخانے لگ رہے ہیں' فیکٹریاں چل رہی ہیں۔"

"ارے تو اس کا مطلب ہے ملک کی مالی حالت سدھر رہی ہے۔ کچھ سالوں

میں ہندوستان بھی ماشاء اللہ ولایت اور امریکہ سے ٹکر لینے لگے گا۔"

مجھ سے اب چپ نہ رہا گیا اور بول ہی پڑی۔

تھوڑی دیر کیلئے دونوں سناٹے میں رہ گئیں، جیسے دخل در معقولات سے چڑ گئیں۔

آپ ہندو تو معلوم نہیں ہوتیں؟" انہوں نے بڑی ہی نرمی سے پوچھا۔

شکر خدا کا اسی وقت مجھے چھینک آ گئی۔

"عیسائی ہیں۔" پتہ نہیں میری چھینک سے عیسائیت کیوں کھٹکتی نظر آئی۔

"ایک گلاس پانی دیں گی۔" میں نے نہایت چھوٹا سا کاغذ کا کپ بڑھایا اور حضرت عیسیٰ کے دار پر لٹکے ہوئے خون چکاں جسم کو اجاگر کرنے لگی۔

آپ نے بڑی کام کی بات کہی۔" میں نے چاہا ٹوٹے تار پھر جڑ جائیں۔

"آپ بڑی پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہیں۔"

میں نے ساڑھی کے پلو میں دوسری چھینک دبوچ لی۔

مگر جوں جوں ملک خوش حالی کی طرف بڑھ رہا ہے توں توں بھوک اور بے کاری بڑھتی جا رہی ہے کیوں؟"

"اللہ جانے۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک دم سارا الزام دور جھٹک دیا۔

"بات یہ ہے کہ بس ہوس بڑھتی جا رہی ہے۔"

"جسے دیکھو چٹکی بجاتے کروڑ پتی بننا چاہتا ہے۔ پہلے تو انگریز تھے، بھئی تھے لوٹتے تھے۔"

"اے تو سات سمندر پار سے آئے کس لئے تھے؟ جھک مارنے؟ لوٹتے نہ تو کیا لڈو بانٹتے؟"

"پھر راجے مہاراجے زمین دار تعلقہ دار تھے۔"

"اور اب!" میں نے پوچھا۔

"اب یہ بڑے آدمی ہیں۔"

"یہ بڑے آدمی کہاں سے آئے؟"

"اللہ جانے کہاں سے پھٹ پڑے۔ پہلے تو دو چار رلے ٹاٹے تھے، تھے کہ نہیں۔" انہوں نے اپنی ہمسائی سے پوچھا۔

"بہت سے راجے مہاراجے کارخانے کھول بیٹھے اور سرمایہ دار بن گئے۔" میں نے لقمہ دیا۔ "یا ان میں حصہ دار بن گئے جو کمپنیاں ولایت والوں نے کھولیں۔"

"اے تو کیا برا کیا ہے بے چاروں نے؟"

"لاکھوں کروڑوں کو روزگار دیا۔ ملک میں ہر مال بننے لگا۔"

"تو پھر کم بخت غریبی کیوں نہ مٹی؟"

"مگر امریکہ اور یورپ میں کیسے مٹ گئی؟"

"آپ کو معلوم ہے کہ ایک فیکٹری کے مالک اور مزدوروں کی آمدنی میں کتنا فرق ہوتا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہونا بھی چاہئے، وہ روپیہ جو لگاتا ہے۔"

"پھر منیجر اور دوسرے افسروں کو بھی مزدور سے زیادہ ملتا ہے۔"

"وہ تو ملتا ہی ہے، بھلا ولائتی یا ولایت پاس کے برابر ایک ٹوٹے پھٹے مزدور کو کیسے مل سکتا ہے؟"

"اچھا جتنا زیادہ مال بنے گا اتنا ہی زیادہ فائدہ۔"

"ہاں۔"

مگر جو مال بنتا ہے اس کا خریدار مزدور تو نہیں کہ اسے تو دو وقت کی روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے، پھر مال خریدے کون؟ جو منافع پورا ہو اور مزدور کو زیادہ مختار نہ ملے۔"

"اے ہے تو سارا مال مڑ جاتا ہے۔"

"اور کیا بہن۔" ان کی ہمسائی بولیں۔ اے یہ تو بڑی مصیبت ہے!"

"تو پھر یورپ اور امریکہ والے کیسے پھلے پھولے؟"

اول بات تو یہ ہے کہ پہلے ولایت والے ایک دوسرے کو لوٹتے رہے۔ اپنی رعایا کو لوٹتے رہے مگر وہاں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ حکومتوں کے تختے الٹ گئے تو پھر نئے ملک دریافت کرنے گئے۔ ان ملکوں کو لوٹا' ہندوستان کو بھی لوٹا' مگر ہندوستان نے کسی کو نہیں لوٹا۔"

"ہاں بھئی یہ بات تو ہے۔"

"اور جب سے انگلستان کے قبضہ سے یہ ملک آزاد ہوئے ہیں' انگلستان کی وہ دھوم دھام ختم ہو گئی' لوٹنے کیلئے کوئی ملک نہ رہا۔

اس جنگ نے تو بالکل ہی حلیہ خواب کر دیا۔ نگوڑے انگریزوں کا۔"

"اور امریکہ؟" نیلے غرارے والی بولیں۔

انگلستان نے امریکہ دریافت کیا۔ پہلے وہاں وہ لوگ بھیجے جنہیں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی۔ امریکہ کے اصلی باشندے ریڈ انڈین سے ان کی جنگیں ہوتیں۔ بہت بری طرح پٹے مگر انگلستان کے پاس ہتھیار تھے۔ اس نے اپنی فوجیں بھیجیں۔ اور سارے یورپ کے پریشان' بھوکے' ننگے امریکہ کی طرف دوڑ پڑے۔ ریڈ انڈین سے ملک چھین کر قبضہ کر لیا۔ انہیں مار مار کر ختم کر دیا۔ آج وہ لوگ بنجر زمینوں پر ہمارے آدمی باسیوں کی طرح رہتے ہیں۔"

"اے تو کیا امریکہ انگریزوں کا ہے؟"

"تھا مگر وہ جنہوں نے امریکہ پر قبضہ کیا تھا۔ انہوں نے انگریز حکومت سے بغاوت کر کے آزاد ہو گئے۔

"ہماری طرح؟"

"بالکل ہماری طرح' مگر امریکہ کو سستے مزدور ملے۔ کچھ یورپ کے فقیر اور نادار' کچھ وہ افریقہ کے کالے لوگوں کو پکڑ لائے۔ ان کالے لوگوں کو وہ بالکل جانوروں کی طرح رکھتے تھے جیسے کتوں کو راتب دیتے ہیں' گھوڑوں کو دانہ دیتے ہیں اور پوری محنت لیتے ہیں۔ بلکہ کتوں اور گھوڑوں کی حالت ان سے بہت بہتر ہے۔ ایک تو وہ بہت سستے آ جاتے تھے' دوسرے کتے اور گھوڑے قیمتی ہوتے ہیں ان کی

دیکھ بھال زیادہ مہنگی پڑتی ہے۔ یہ نیگرو جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ انہیں شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ بس بچے پیدا کرنے پڑتے تھے جو مالک کی مرضی سے بیچے اور خریدے جاتے تھے۔"

"یا اللہ! یہ انسان تو شیطان کے بھی کان کاٹتے ہیں۔" ہم سب سوچ میں ڈوب گئے۔ میں نے سوچا یہ ملک ترقی کر گئے۔ آخر میں نیگرو آزاد کر دیئے گئے۔ لیکن ان کی وہی حالت ہے جو ہمارے ملکوں کے غریب طبقہ کی تھی اور ہے۔ اب بھی نیگرو بڑی بری حالت میں رہتے ہیں۔ دوسری جنگ سے پہلے امریکہ ہر طرح سے خود مختار تھا۔ دھڑلے سے پیداوار بڑھاتا تھا۔ اور ملک کی خوش حالی بڑھاتا تھا۔ مال پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ خریدار بھی پیدا کرو۔ کام کرنے والے کو اتنا دو کہ پیداوار کو خرید سکے۔ ہندوستان کے کنگال ریفریجریٹر' ٹی وی' ٹیلی فون' موٹریں گاڑیاں اگر خریدیں گے نہیں تو منافع کیسے ہو گا۔ فیکٹری کیسے چلے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کروڑ پتی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں اتنا بڑا کوئی نہیں جتنے امریکہ میں ان گنت ہیں۔ دوسری جنگ کے بعد امریکہ میں خوش حالی کی افراط ہوئی۔ دولت کی ریل پیل ہونے لگی۔ ہر میدان میں امریکہ نے دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سوائے روس کے جو کمیونسٹ ملک ہے کوئی اس کی ٹکر کا نہ رہا۔ ادھر چین اور روس امریکہ کیلئے خطرہ بن گئے۔ انگلینڈ اور یورپ سے تو امریکہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ جو دم تھا' ہٹلر اور مسولینی نے نکال دیا جو ملک فرانس اور انگلینڈ وغیرہ کے شکنجہ سے نکلے وہاں کے حکمراں طبقہ سے امریکہ کا یارانہ بڑھا جس میں کمیونزم ٹانگ اڑاتا رہا۔ کوریا اور ویت نام میں امریکہ کے دوست طبقہ پر بری بیتنے لگی۔

انگلینڈ کے پاس تو نوآبادیات سے سمیٹا ہوا کوڑا تھا۔ جو جنگ میں آگے آگے گولہ بارود کا نوالہ بنتا تھا۔ امریکہ کو اپنے لاڈلے بھیجنے پڑے۔ مگر اونچے طبقہ کے نونہال اکثر بچ گئے۔ درمیانہ طبقہ اور نیگرو جھونکنے پڑے۔ امریکہ بھی ایک عجیب و غریب ملک ہے۔ وہاں کروڑ پتی بھی ہیں جو اپنے ملک میں ٹیکس سے بچنے کیلئے دوسرے ملکوں میں سمیٹنے کے طور طریقے نکال رہے ہیں۔ عام طور پر بچھڑے ہوئے

ملکوں میں لمن کے پنجے آسانی سے گڑ جاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ان ملکوں کو ہتھیار خریدنے کیلئے تو امریکہ کے آگے ہاتھ پھیلانا ہی پڑتا ہے۔ مگر دوسری طرف عام امن پسند عوام ہیں جو اپنی محنت سے سنوارے ملک کی دولت پر قانع ترقی کی منازل طے کرتے ہیں۔ کوئی کسی کو محتاج نہ بنائے۔ اکثریت اسی جیالے انسان کی ہے۔ اس طبقہ نے جب بھی کوئی فیصلہ کیا اس پر عمل کر کے ترقی کی' غلامی سے نجات پائی۔ اور آج اس ریڈ انڈین طبقہ کی بقا کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ جس کو جد امجد نے لوٹ کھسوٹ کر خاک میں ملا دیا۔ اسی طبقہ نے ویت نام میں خون بہایا مگر پھر ہوش آیا تو اسی طبقہ کی حماقتی اور زیادتی کا احساس پیدا ہوا۔ اور ویت نام کی جنگ میں امریکی سپاہی نے اپنے سے کمزور دشمن کے آگے ہتھیار ڈال کر تاریخ میں ایک نادر مثال پیدا کر دی۔ امریکہ کا نازی طبقہ بے دست وپا ہو گیا۔ اسی طبقہ نے نکسن کو برہنہ کر کے عرش سے فرش پر دے مارا۔

یہ آخری الفاظ میرے منہ سے بہ آواز بلند نکل گئے۔ میرے ہمسفر بیویاں چونک پڑیں۔

"اے موئے امریکی جوان بھی دیوانے ہیں؟"

"جی ان ہی دیوانوں نے امریکہ تعمیر کیا ہے۔ یہی ان کے رکھوالے ہیں۔ اگر انہوں نے ایک دن فیصلہ کر لیا تو وہ ان اجارہ داروں کو بھی ٹھکانے لگا دیں گے جو اس وقت امریکہ کی سرکار مٹھی میں دبوچے بیٹھے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ایک کنگال سوکھا مارا انسان امریکہ کا صدر بن گیا تھا کہ ابراہیم لنکن کی عظمت اس کے بنک بیلنس میں نہیں اس کی شخصیت اس کی ذہانت' دیانتداری اور عوام دوستی میں تھی۔ آج صرف لکھ پتی دوسرے کروڑ پتیوں کی سہائتا سے صدر کی کرسی پا سکتے ہیں۔ ایک دن تھا کہ امریکہ سب سے کامیاب اشتراکی ملک کا درجہ رکھتا تھا جس کا نام صرف جمہوریت تھا۔ مگر نیگرو کے علاوہ تقریباً ہر انسان خوش حال تھا آج چند منافع خوروں نے امریکہ کو چکر میں ڈال رکھا ہے۔"

اے بہن توبہ کیجئے' امریکی ہوئے ننگے' بے شرم۔ اے افضال میاں کے تکیہ

کے نیچے ایک دن ایک میگزین دیکھی، اے میری بہن بزری چم مادر زاد ننگی لونڈیا۔ کیا بتاؤں کیسے کیسے چھوٹے کپڑوں کے اشتہار، اور اللہ میری توبہ کیسے کیسے مردوں کو پھانسنے کے گر، کہ چھنو نایکہ بھی کان پکڑ لے۔ کہ پوڈر، لب اسٹک، مرد پھانس ننگے کپڑے نگوڑی بے حیا۔"

مگر امریکہ کی ساری عورتیں ننگی نہیں وہ بھی تو ہیں جو بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ سائنس اور میڈیکل میں انجینئرنگ میں علم وادب میں...!"

"اے بہن بس رہنے دو۔ ہم نے تو بس ٹانگیں اچھالتی، سینہ چھلکاتی، ذرا سی دھجی چپکائے انگڑائیاں لیتی، چوما چاٹی کرتی ہی دیکھی ہیں۔"

"ویسے تو غیر ملکی ہماری فلمیں دیکھ کر بھی یہی کہتے ہوں گے کہ ہندوستان میں بس موٹی موٹی لڑکیاں جنگلوں میں لونڈوں سے چہلیں کرتی رہتی ہیں اور بھائی اب تو ہماری میگزینوں میں بھی خدا کے فضل سے ننگی عورتیں جگمگانے لگی ہیں۔ ویسے تو سڑک پر کتنی ننگی فقیرنیاں پڑی گھومتی ہیں۔" نیلے غرارے والی بولیں "کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

وہ گھناؤنی اور گندی ہوتی ہیں، برہنگی اگر چٹپٹی اور مزے دار ہو تب ہی توجہ وصول کرتی ہے۔ اور اسی لئے یہ برہنگی بکتی ہے۔ امریکہ سے بھی جو جھلملاتی برہنگی آتی ہے وہی وہاں بھی بکتی ہے اور یہاں بھی ہر مال پہ ننگی حسینہ کا ٹھپہ لگا کے بیچنا پڑتا ہے۔"

مگر ولایت اور امریکہ میں تو حد ہے بہن۔"

"امریکہ اور ولایت کا بازار بھی اسی لئے بڑا لمبا چوڑا ہے۔"

"دولت بٹورنے کے لئے اپنی اماں بہنا کو بیچتے ہیں۔"

"نہیں دوسروں کی اماں بہنا کرائے پر مل جاتی ہیں۔"

"اور کوئی اللہ کا بندہ ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ۔"

"کس کے منہ میں زبان ہے جو پوچھے زبانیں خریدی جا سکتی ہیں۔"

"نہ کوئی لکھے۔"

"سب قلم بکاؤ ہیں۔"

"اے بس چھوڑو اس قصے کو دم بولا گیا۔ ہاں وہ بات تو ٹل ہی گئی، کمیشن کی، علی گڑھ جمشید پور، یہ کمیشن بیٹھا ہے۔"

"ہاں بہن بیٹھا ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟"

"وہی جو اور کمیشنوں کا ہوا۔"

"میں پوچھتی ہوں یہ کمیشن کون سی نئی بات معلوم کریں گے جو طشت از بام نہیں ہے معلوم ہے یہ سب ٹالنے کے طریقے ہیں۔ دنیا میں کوئی جنگ مذہب کے لئے نہیں لڑی گئی۔ ہر جنگ میں زر زمین پر قبضہ کا سوال تھا۔ آج بھی ہندوستان کسی دوسرے ملک پر قبضہ تو نہیں کر سکتا اس لئے اپنے ہی ملک کے کمزوروں کو مار کے چھین جھپٹ لیتا ہے۔ علی گڑھ میں وہ زمین جہاں غریب مسلمان رہتے تھے اور ہریجن رہتے تھے، بہت قیمتی تھی بہت کہا اللہ کے بندوں نے بیچنے سے انکار کر دیا، بس چھین لی۔"

"چھینی تو نہیں۔"

"اور چھیننے والے کے سر پر سینگ ہوتے ہیں۔ مار دھاڑ کے بعد اور بھی آسانی سے جگہ مل جاتی ہے بچے کھچے گھربار اونے پونے بیچ کر بھاگ جاتے ہیں۔"

"اور ایسے محلوں میں جا بستے ہیں جہاں ان کی اکثریت ہو تاکہ محفوظ رہیں۔"

"محفوظ خاک رہیں، ہاں مارنے والوں کو آسانیاں مل جاتی ہیں۔ سب کے سب ایک جگہ چوہوں کی طرح مار لئے جاتے ہیں۔ جیسے یہودی ایک جگہ مل کر رہتے ہیں یا انہیں آہستہ آہستہ ہنکا کر ایک جگہ جمع کر کے مار لیا گیا۔ وہ ایک ہی بات ہوئی۔

"خدا سمجھے ان ظالموں سے کیڑے پڑیں، ان کی میت سڑے۔"

"خدا ان ظالموں کی مٹھی میں ہے۔ ان کی مسجدوں اور مندروں کی میناروں

پر سونے کے کلس کس نے چڑھائے۔ سونے کے دروازے مخمل کے کارچوبی مزار پوش ہیروں جڑی مورتیاں کس نے سجائیں؟" یہ ان کنگالوں نے چڑھائیں جو بے کوڑی پیسہ خرچے دنیا کی نعمتیں مانگتے ہیں۔ اب آپ نے دیگ مانی ہے نا خواجہ کے لئے۔"

"ہاں ڈھائی ہزار دے آئی ہوں۔ جب پورے چودہ ہزار انشاء اللہ بھیج دوں گی تو دیگ چڑھ جائے گی۔ چھوٹی دیگ لی ہے بڑی تیس میں چڑھتی ہے۔"

"آپ جائیں گی دیگ چڑھانے؟"

"نہیں میری ضرورت نہیں، مجاور صاحب سب انتظام کر دیں گے۔ میں تو اگلے مہینے انشاء اللہ شارجہ بیٹے کے پاس جا رہی ہوں۔ وہیں سے حج بھی اللہ کے کرم سے ہو جائے گا۔"

"شارجہ سے تو جلد ہی دیگ کے باقی روپیہ بھجوا سکیں گی۔"

"ہاں یک مشت بھجوا دوں گی، احمد میاں کی نوکری کیلئے تو دیگ کی منت مانی تھی انہوں نے ڈھائی ہزار بھیجے، باقی میں جا کے بھیج دوں گی۔"

"اللہ مبارک کرے۔" پھر میں نے سوچا خواجہ میری کیا سنیں گے۔ میں اجمیر گئی تو آنے جانے کا خرچہ سارا سلمہ کے سر۔ وہاں پھولوں کی چادر میں گیارہ روپیہ خرچ ہوئے وہ سلمہ نے دیئے۔ اڑ گئی ہاں میں تھال سر پر رکھ کر درگاہ میں داخل ہوئی۔ زمین توے کی طرح جل رہی تھی اور مجھے دوزخ کا خیال ستا رہا تھا جہاں میرے گناہوں کی سزا ملے گی۔ چادر مزار پر چڑھاتے وقت میں نے زیر لب خواجہ سے درخواست کی کہ یہ گیارہ روپے پھولوں کے سلمہ کے حساب سے میں جمع کر لیں، ویسے تو وہ غیب داں ہیں مگر یونہی ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے عرض خدمت ہے کہ بندی کے کھاتے میں بھول چوک سے کچھ پڑ گیا تو.... تو کچھ زیادہ فرق تو نہ پڑے گا۔ ایک آدھ انگارہ ہی ٹھنڈا ہو پائے گا۔ دوزخ کے لپلپاتے ان شعلوں میں حقیر سا بجھا ہوا گھٹیلے کا انگارہ کون سا تیر مارے گا۔

نہیں مولا میں جنت میں دودھ کی نہروں اور زمرد کے محل کی امیدوار نہیں

کہ مجھے فن روپیہ سازی نہیں آتا۔

"ہاں تو بہن پر اب اقلیتوں پر بھی کمیشن بیٹھا ہے۔"

بہن آپ کو تو وہم کا مرض ہے۔ اب تو ماشاء اللہ چیف کمانڈر لطیف ہیں۔ چیف جسٹس ہدایت اللہ ہیں اور اس سے پہلے مولانا آزاد تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین تھے اور.... پھر گاندھی جی تو....."

اور مجیب الرحمٰن، پر خدا جانے کہاں بھول چوک ہو گئی۔

"ایک بات بتاؤ بہن، یہ بہاری پاکستانی ہیں یا بنگلہ دیشی؟"

اے بھئی میں اللہ ماری کیا جانوں کون کون ہے، سب اللہ کے بندے ہیں۔ مگر میری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔ "کمیشن بیٹھا ہے تو کچھ نہ کچھ ہو گا ہی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ بس.... کوئی اندھیرا ہے؟"

"اے لوگ یوں ہی بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو کمیشن کی رپورٹ نکلتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر!" دونوں اپنے اپنے چہروں پر اطمینان طاری کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اتنے میں کسی نے پکارا۔

"آنٹی!"

"پمی" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ پریم سنگھ کو پیار میں سب پمی کہتے ہیں۔ گودوں کھلایا ہے، اے روڈ پر ہی رہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا۔

"سلمہ اجمیر لے گئی تھی۔"

"کہاں ہیں سلمہ؟"

"رات بھر بچے کو بخار رہا جاگی رہی ابھی سوئی ہے ادھر کمپارٹمنٹ میں۔"

ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ گیا تو دونوں بیویاں مجھے شکی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"آپ سکھ ہیں؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے وجود کا الزام کس فرقہ پر تھوپوں۔ میں کھڑکی

کے باہر دیکھنے لگی۔ نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔ پھر جیسے میں نظروں سے اوجھل ہونے والی ٹوپی پہن لوں گی۔ کوئی مجھے نہ ڈھونڈ سکے گا۔ میں کسی کے ہاتھ نہ آؤں گی.... مگر پھر ایک دم مجھے ایک عام جرمن شہری کی بات یاد آگئی۔

"میں چپ رہی۔"

سب سے پہلے انہوں نے کمیونسٹوں پر حملہ کیا۔
میں تو کمیونسٹ نہ تھا۔ میں چپ رہا۔
پھر انہوں نے ٹریڈ یونینوں پر چھاپہ مارا۔
میں تو ٹریڈ یونین میں نہیں تھا۔ میں چپ رہا۔
پھر انہوں نے یہودیوں پر ہاتھ صاف کیا۔
میں تو یہودی نہیں تھا۔ میں چپ رہا۔
پھر انہوں نے کیتھولک پر چوٹ کی۔
میں تو پروٹسٹنٹ تھا۔ میں چپ رہا۔
پھر انہوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔
اس وقت تک سب زبانیں بند ہو چکی تھیں۔
کوئی بولنے والا نہ بچا تھا۔

اپنا خون

سمجھ میں نہیں آتا، اس کہانی کو کہاں سے شروع کروں؟

وہاں سے جب بجمی بھولے سے اپنی کنواری ماں کے پیٹ میں پلی آئی تھی اورچار چوٹ کی مار کھانے کے بعد بھی ڈھٹائی سے اپنے آسن پر جمی رہی تھی اور اس کی میا نے اسے اس دنیا میں لانے کے بعد اپلوں کے تلے دباتے دباتے ممتا کی ان جانی سی کیل کلیجے میں چبھنے پر چھاتی سے لگا لیا تھا۔

یا وہاں سے جب بجمی کی ماں کو جمن مردار خود ازراہ کرم بیاہ کر لے گیا تھا۔ کیوں کہ تلے اوپر اس کی تین چار بیویاں ٹھکانے لگ چکی تھیں اور اس کی اندھی ماں کی دیکھ بھال کے لئے اس کے تینوں لڑکے بہت چھوٹے تھے اور اس وقت بجمی بھی اپنی حرافہ ماں کے ساتھ ٹین کی صندوقچی اور گُمرروں کی پوٹلی کے ساتھ بیل گاڑی میں دھری جمن کے گاؤں پہنچ گئی تھی---- بالکل اسی طرح جیسے وہ ایک دن اپنی الہڑ ماں کی کوکھ میں پہنچ گئی تھی۔

یوں تو کہانی وہاں سے بھی شروع کی جا سکتی ہوے جہاں لگان نہ دینے کی وجہ سے نایب کے جوتوں کی تڑاتڑ سے جمن کا جوار باجرے سے بنا ہوا اودا اودا خون ناک کے راستے نکل رہا تھا۔ اور کوئی راستہ نہ پا کر اس نے تیرہ برس کی بجمی کو اس کی ماں کا لہنگا پہنا کر سولہ برس کی عورت بنانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور پھر نایب کے جوتے تڑتڑانا بند ہو گئے تھے اور بجمی محل کے زنانہ شاگرد پیشے میں یوں پہنچ گئی تھی جیسے وہ ہمیشہ وہاں پہنچنے کی عادی تھی۔

نہیں، شاگرد پیشے میں تو کہانی بالکل اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ دوسری باندیوں نے اس کا لہنگا اٹھا کر اس کا خوب کھیل بنایا تھا۔ جیسے پنجرے میں نئی چڑیا ڈال دی جائے تو ساری چڑیاں اس پر ٹوٹ پڑتی ہیں، اسی طرح بجمی پر ٹھونگوں

کی بوچھاڑ ہونے لگی---- مگر بچھمی پھولوں کی سیج پر تو پلی نہ تھی جو چٹکیوں طمانچوں کو خاطر میں لاتی۔ اور نہ لہنگا اٹھ جانے سے اس کی شان میں کوئی بٹہ لگ جانے کا خطرہ تھا۔ لہنگے سے اسے یوں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ صرف میلے ٹھیلے کے موقع پر گھگریا پہنتی تھی' جو لوٹتے وقت فوراً" اتروا لی جاتی تھی کہ کہیں کیچڑ دھول میں ستیاناس نہ لگ جائے اس کا روزانہ کا لباس چند چیتھڑے تھے جنہیں وہ لنگوٹ کی طرح کس کے باندھ لیا کرتی تھی۔ ماں کے گھیردار لہنگے سے اسے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ پھر نیفے میں بسی جوئیں الگ کھسوٹ رہی تھیں۔ جب لونڈیا ہنستے ہنستے تھک گئیں تو نئی شرارتیں ایجاد کرنے لگیں۔

"اری نامراد تو نے خانم صاحب کو مجرا کیا کہ نہیں؟" گل بدن بولی۔

"سلام کیا تھا۔ یہ مزرا کیا؟"

نوبہار تو زمین پر لوٹن کبوتر بن گئی۔۔ "اری سلام نہیں مجرا۔ ابھی تک نہیں کیا تو بس سمجھ لے تیری خیر نہیں۔ دیکھ پہلے خانم صاحب کے سامنے جا کے تین بار خوب جھک کر سلام کر---- ایسے شبو نے سلام کر کے بتایا۔ "سمجھی؟"

بچھمی نے من بھر کی منڈیا ہلا دی۔

"ہاں' اور دیکھ پھر نہایت ادب سے لہنگا اٹھا دینا----" صنوبر کھلکھلانے لگی۔

"چپ رہو گدھیو! ہنسنے کی کیا بات ہے جی!"

"اور دیکھ' مروے شوئی ہنسنا نہیں' ورنہ یہ سمجھ لے کھود کے وہیں چوکی تلے گاڑ دیں گی۔"

بچھمی سمجھ گئی۔

زمردی خانم' لونڈیوں کی داروغن' عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مصلے پر بیٹھی ہزار دانہ پھیر رہی تھیں۔ حور و قصور دماغ میں رچا ہوا تھا۔ نگاہوں میں تقدس اور چہرے پر دھڑیوں نور برس رہا تھا۔ ان کا سن بھی بچھمی کا سا تھا۔ یوں گوشت کا پہاڑ تھوڑا ہی تھیں۔ بچھمی نے سلام کیا تو وہ عالم بالا کے تصور ہی میں کھوئی ہوئی تھیں

مگر جب لہنگا اٹھا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک دھماکے کے ساتھ وہ بنجر زمین پر آ رہیں۔

کہاں یہاں بالکل دوسرا ہی پلٹا کھا سکتی تھی۔ شاید بچھمی پھر جمن کے سر پر پٹخ دی جاتی' جہاں پھر جوتے منڈلانے لگتے اور اودا خون بہنے لگتا۔

مگر ایسا ہوا نہیں کہ کیچڑ میں سچا موتی رل رہا ہو تو جوہری کی آنکھ دھوکا نہیں کھاتی۔ بچھمی کی میل جمی ٹانگوں پر سنہرے رونگٹے دیکھ کر زمردی خانم نے فوراً بھانپ لیا کہ موتی کیچڑ میں سنا ہوا ہے۔ انہوں نے اشارے سے بچھمی کو پاس بلایا۔

لونڈیوں باندیوں کی گھگی بندھ گئی---- اب خانم جھک کر سلیم شاہی جوتی اٹھائیں گی اور پھٹکی پھٹکی کر کے بچھمی کا بھیجا دالان در دالان چھٹک جائے گا۔ نہیں---- شاید بیٹھے بیٹھے اس کے پیٹ میں لات ماریں گی۔ خانم کی لات میں عربی گھوڑی جیسا زناٹا تھا۔ لطیفہ کے پیڑو پر یہی گھوڑی کی لات پڑی تھی جو خون کے اتنے دست آئے کہ وہ چل دی اللہ میاں کے ہاں۔

مگر خانم صاحب نے نہ عربی گھوڑی والی دولتی جھاڑی' نہ زرکار سلیم شاہی سنبھالی۔ وہ کالی ٹانگوں پر سونے کے تاروں کی نقاشی دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اسے سب جگہ سے ناپا ٹٹولا۔ سب کچھ جمع جوڑ کر تیرویں سال کی رقم سے تقسیم کیا۔ جواب؟ لاجواب!

خانم کے ہاتھوں سے نہ جانے کتنی باندیاں کاٹ چھانٹ کے بعد حسن و جوانی کے مرقع بن کر نواب صاحب کی سیج کو گرما چکی تھیں۔ کیا معرکے کی نگاہ پائی تھی' پیٹ کی لونڈیا کو بھی ناپ تول کر چٹکی بجاتے میں بھانپ لیتی تھیں کہ کوکھ میں بدمنی براج رہی ہے یا کوئی چڑیل پیر پسار رہی ہے۔ ناپ تول سے یہ تو عورت بنتی ہے۔ کولہے' کمر' سینہ' بازو' پنڈلیاں' رانیں' گردن۔

حسن کے مقابلوں میں جیسے پور پور ناپی جاتی ہے' بالکل اسی طرح خانم کی نگاہوں کا فیتہ کام کرتا تھا۔

ہاں' اب یہاں سے اصل کہانی شروع ہوئی۔ خانم صاحب نے نورن دائی کو

طلب فرمایا- اسے لیبارٹری یعنی حمام تیار کرنے کا حکم دیا- پہلا ہنگامہ تو بچھمی کے جوؤں بھرے سر نے کھڑا کر دیا- اس کا علاج فوراً قینچی سے کر دیا گیا- خشخاشی بال کرنے کے بعد بھی تالو سے چمٹی ہوئی جوئیں بالکل بچھمی کی طرح سخت جان ثابت ہوئیں- دھو پھٹک کر بچھمی چٹائی پر پھیلا دی گئی- آنکھیں اور ناک کے نتھنے چھوڑ کر اس کے بدن پر کوئی کمقتی رنگ کا لعاب دار مسالہ تھوپ دیا گیا- پھر اسے کھولتے ہوئے پانی سے دھویا گیا- اس کے بعد کوئی دوسرا لیپ چڑھایا گیا-

بچھمی چپ چاپ سسکیاں لیتی رہی---- خانم صاحب اس کے کوفتے پکا رہی ہیں' مسالہ لگا کر چھوڑیں گی' پھر اسے سیخوں پر چڑھا کر انگیٹھی پر سینکا جائے گا پھر کتوں کو کھلایا جائے گا- ہفتہ بھر بچھمی دہلتی رہی چھنتی رہی- اس کی نس نس پھوڑے کی طرح ٹیکتی رہی- دو دن بخار بھی چڑھا- پھر لیپ ختم ہو کر مرہم چپڑے جانے لگے اور بچھمی کی ٹیسیں کم ہوئیں-

ہفتہ بھر گزرنے کے بعد وہ بالکل پانی میں پھوٹی ہوئی کنول کی کوپل کی طرح نکل آئی- اس عرصے میں اسے دودھ اور شہد کے سوا کچھ کھانے پینے کو نہ ملا- بھوک کے مارے وہ بلبلاتی رہتی مگر کوئی شنوائی نہ ہوتی- موٹی بیجھڑ کی روٹی اور چٹنی کھانے والی کا ینیوں اور شوربوں سے کیا بھلا ہوتا- دس بارہ خربوزے ایک سانس میں صاف کر جانے والی سردے کی ایک قاش سے کیا - ایک دن وہ چپکے سے شاہی مطبخ میں پہنچ گئی اور اتنا ہبڑ ہبڑ کر کے کھایا کہ تین دن تک دستوں کے مارے ہلکان ہوا کی- پھر اسے مسہل دیے گئے' جوشاندے اور معجونیں چٹائی گئیں اور پھلوں کے رس حلق میں ٹپکائے گئے-

چھ مہینے بعد خانم صاحب نے اسے اپنی تجربہ گاہ سے جب نکالا تو وہ چودہ سال کی ہو چکی تھی- اس کا رنگ کافور کی طرح سفید ہو گیا تھا- بال کندھوں کو چھو لیتے' اگر خم دار نہ ہوتے-

اب انہوں نے اسے زیتون کے تیل میں ڈبو کر جڑی بوٹیوں میں بسائے ہوئے پانی سے بار بار دھویا- صابن کے بغیر صرف پانی کی دھار سے تیل کی چکنائی

چھڑانے میں جو محنت اور وقت صرف ہو' اس کا تو کچھ حساب ہی نہیں۔ پھر گھسا ہوا صندل اس کے انگ انگ پر مل کر پپڑیاں چھٹائی گئیں۔ زائد بال موچنے سے اکھاڑے گئے۔ پھر اسے پنڈلیوں پر چپکا ہوا کورے دھلے نین سکھ کا آڑا پاجامہ اور شبنم کا زرکار کرتا پہنایا گیا۔ اس کے بالوں کے چھلے سنوار کر کارچوبی ٹوپی لگائی گئی۔ موتی جڑی چوڑے گریبان کی صدری اور تلے کی موجڑی پہنائی گئی۔

جب بجمی پھولوں کے گجرے لے نواب بیگم کی خواب گاہ میں پہنچی تو وہ نہ ہلیں نہ جلیں' بس گم صم مخملیں تکئے پر کہنی ٹکائے اسے دیکھتی رہیں۔

"غضنفر نواب۔" بڑی مشکل سے ان کے ہونٹ سکی میں ملے۔

مجرے کے بعد بجمی نے دو زانو ہو کر گجروں کا تھال ادب سے پیش کیا۔

کانپتے ہوئے سہمے سہمے ہاتھ سے انہوں نے سونے کے چھلوں کو چھوا۔ کنپٹی پر سنہرا غبار سا لرز رہا تھا۔ گلے کی انگلی بہکتی ہوئی رخسار کے بھورے تل کو چومتی ہونٹوں پر کانپنے لگی۔ چرکا سا لگا اور انہوں نے کہنی میں مونہہ چھپا کر ایک آہ بھری۔

"غارت ہو۔" انہوں نے آواز گھونٹ لی۔

بجمی کے ہاتھ سے پھولوں بھرا تھال چھوٹ پڑا۔ خانم صاحب نے جھک کر اسے ٹھوکا دیا اور وہ بھد سے بیٹھ گئی۔ انگلی کے اشارے سے انہوں نے اسے دفعان کیا اور پھول اٹھانے لگیں۔

"حضور! خانم صاحب نے نواب بیگم کی پیشانی سے لٹ ہٹائی۔

"غارت ہو۔" نواب بیگم چھلک پڑیں۔ مگر خانم صاحب غارت نہیں ہوئیں' وہیں پٹی پر ٹک گئیں۔ اور ہولے ہولے بیگم کی پنڈلیاں سوتنے لگیں۔ نواب بیگم سسکتی رہیں۔ انہوں نے پاؤں جھٹک دیئے۔ خانم صاحب نے زندگی بھونچال کے جھٹکے سہہ کر گزاری تھی۔ وہ جمی رہیں۔

"لونڈی سے خطا ہوئی تو اسی دم غلاموں باندیوں کو حکم دیجئے کہ محل سرائے کے ستون سے باندھ کر سرکاری کتے چھوڑ دیئے جائیں۔ یا حکم فرمائیں تو باندی کے

صندوقچے میں سم قاتل کی کمی نہیں، ایک بوند اس زمین کے بوجھ کو دوزخ میں جھونکنے کے لئے کافی ہوگی۔"

بیگم نواب سسکتی رہیں۔ پاؤں نہ جھٹکے۔

"مجھے شبہ ہوا تھا نواب بیگم، اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟"

بیگم نواب کی سسکیاں طول پکڑنے لگیں۔

پندرہ برس پہلے--- نواب حضور کی بھولی بات بنی وہ سانسیں گن رہی تھیں۔ محل سرا کی سنگین دیواریں تھیں اور نواب بیگم کی دھڑکتی ہوئی نبضیں محلوں کے سارے شعبدے پھیکے پڑ چکے تھے۔ نواب بہادر انہیں چکھ کر اور کہیں مونہہ کا مزہ بدلنے لگے۔ خوان پر خوان سجے بنے موجود تھے جدھر جی چاہتا مونہہ مار لیتے۔ الابلا سب ہڑپ کر جاتے۔ نئی تھالی سامنے چنی جاتی، دو چار مہینے میں اس سے پیٹ میں اپھارا پیدا ہونے لگتا---- کھٹی ڈکاریں آنے لگتیں، فوراً" دوسری ڈش کا انتظام ہو جاتا۔ نواب بیگم کو اس بات کی کوئی شکایت بھی نہ تھی، کیوں کہ نوابوں کا یہی دستور ہوا کرتا تھا! خود ان کے والد بزرگوار کے توشہ دان میں تو ولایت تک کے مرغن ترمال آتے جاتے رہتے تھے۔ رجواڑوں میں ان کے ٹیسٹ اور پہنچ کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ویسے ان کی مونہہ چڑھی حبشی حلوا سوہن کی ٹکیا مبروکہ کو جو درجہ میسر ہوا کسی کو نہ ہو سکا۔

مگر نواب بہادر تو گندگی کی پوٹ تھے۔ ان کے حیوانات کی حدوں کو پار کرتے ہوئے پیار پر بیگم کا خون کھول پڑا۔ نواب بہادر اڑ گئے۔ وہ بھی اڑ گئیں۔ بیگم تیر، تلوار پر اتر آئیں اور ان سے پردہ کر لیا--- اب وہ ان کی خواب گاہ کی طرف نہیں پھٹک سکتے تھے، ویسے جشن جلوس کے موقعوں پر وہ پیش پیش رہتیں سجے ہوئے ہاتھی گھوڑوں کی طرح۔

نواب بہادر کی جوتی سے۔ وہ اڑ گئیں تو چولہے بھاڑ میں جائیں۔ انہوں نے اور نکاح کر لئے۔ جب تک بیوی ہضم ہوتی عیش باغ میں رہتی۔ جہاں باسی ہوئی اور جی سے اتری، محل سرا پر پہنچا دی جاتی۔ تھوڑے دن پھنکارتی، بل کھاتی پھر پھن پٹخ

کر چپ ہو جاتی- بیگم کا رتبہ اپنی جگہ- وہ اتری کمان کی فہرست میں داخل ہو کر محل کے ایک کونے میں اپنی چھوٹی سی دنیا بسا لیتی- پھر کسی دوسری کے دن پورے ہو جاتے اور وہ بھی آجاتی- اس کے بعد اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی- ویسے تو نواب بہادر کی جھوٹن پر ساری رعایا پلتی تھی- مگر ان کی جھٹالی عورت فوراً سات تالوں میں قید کر دی جاتی تھی- رشتے دار ملنے آسکتے تھے' کھانے پینے کی افراط کپڑے زیور کے انبار- لیکن مرد کی بو باس تک سے محروم-

کبھی کبھی کسی پرانی بیوی کی کوئی بات یاد آجاتی- نواب بہادر اسے فوراً طلب کر لیتے- نگوڑی کے خوشی سے ہاتھ پیر پھول جاتے- باقی بدنصیب اسے بن ٹھن کر پیا کی بانہوں میں جانے کی تیاریاں کرتے دیکھتیں تو انہیں ہسٹریا کے دورے پڑ جاتے' اور خانم صاحب اپنا طلسمی صندوقچہ لے کر مدد کو دوڑتیں-

بارہا نواب بہادر نے بڑی بیگم کو بھی دعوت نامہ بھیجا- کچھ عرصہ سے اپنے پیر صاحب کے حکم پر وہ بڑی پابندی سے باری باری سب بیویوں کو ان کا حق دینے کو تیار تھے' مگر بڑی بیگم نے نہایت گستاخی سے اپنا حق ٹھکرا دیا- انیس برس کی مجروح' سسکتی جوانی کا پہاڑ اٹھائے دندناتی چلی جا رہی تھیں کہ خلیرے بھائی غضنفر علی خاں ولایت جانے سے پہلے شکار وکار کی دھن میں ریاست میں آنکلے- رشتہ کے بھائی تھے- تین سال چھوٹے تھے- ہتھ چھٹ واقع ہوئے تھے- نواب بیگم کے چھکے چھڑا دیئے-

کیا لہلہاتے' مہکتے دن تھے وہ بھی! دھما چوکڑی ہو رہی ہے سوانگ بھرے جا رہے ہیں- آپا دھاپی' مار کٹائی سے بھی عار نہیں- ہنسی ہے کہ آبشار بن کر ٹوٹی پڑتی ہے- نواب بیگم کی ساری بے رخی بھولا ہوا خواب ہو گئی بچپن لوٹ کر ہمکنے لگا- بھونڈے بھونڈے تماشے ہوتے- چار لونڈیوں کو حکم دیا جاتا' کر دو ایک دوسری کو ننگا- جو جیتے گی سونے کا کڑا یا جڑاؤ ہیکل انعام میں پائے گی- اور پل پڑتیں نامرادیں ایک دوسری پر وہ گھمسان مچتی کہ ہنستے ہنستے آنسو نکلنے لگتے- کپڑوں کی دھجیاں اڑنے لگتیں- لہولہان ہو جاتی- انجام کار جسم پر بس پاجامے کا نیفہ اور

پائنچوں کی موریوں کے چھلے پڑے رہ جاتے۔ پھر ہار جیت الگ رکھ کر سب کو انعام ملتا۔

جب غضنفر میاں ہنسنے پر آتے تو انہیں دین دنیا کا ہوش نہ رہتا، گر گر پڑتے۔ بہت زیادہ ہنسنے پر بیگم نواب کے اوپر آگرتے کبھی بالکل ہی گڈمڈ ہو جاتے۔ بڑی مشکل سے بیگم ان کے پرت اتار کر ہٹاتیں شوخی، شرارت تو ان کی عادت تھی۔ بچہ ہی تو تھے۔ ذرا ذرا سی مونچھیں پھوٹی ہیں---- وہ بھی شاید بار بار مونڈنے سے۔ سر پر تاج تو اللہ کا رکھا ہوا تھا۔ بالکل مہروں کا کچا سونا سر پر ڈھیر تھا۔ دانت کچکچا کر نواب بیگم سنہرے گچھے پکڑ کر ہلا ڈالتیں کچھ لحاظ ہی نہیں سور کو! ہاتھ ہیں کہ بالکل دیوانے! یہ کھیل صاحب زادے نے آنکھ کھول کر سب ہی کو کھیلتے دیکھا تھا۔ باندیاں آپس میں نوچتیں، کھسوٹتیں باہر نوکر چاکر کھلی کھلی باتیں کرتے۔ آتی جاتی کا بکٹا بھر لیا، کلہ نوچ لیا، کمر کھسوٹ لی۔ صاحب زادیاں تو الگ تھلگ سینت کر پالی جاتیں، ہاں لونڈیاں گود ہی میں ہتھکنڈے سکھا دیتیں۔

وہاں دیکھنے ٹوکنے والا کون تھا۔ غضنفر علی کوئی گستاخی کر بیٹھتے تو لونڈیاں ٹھٹھے لگانے لگتیں۔ نواب بیگم کا دم لبوں پر آجاتا۔ کبھی گھڑک دیتیں، کبھی جان بوجھ کر انجان بن جاتیں۔ مگر چھینا جھپٹی سے بات آگے بڑھنے لگتی تو وہ فوراً" بندھ باندھ کر سمٹ جاتیں۔ اور با ادب باملاحظہ ہو جاتیں۔ انہیں بے قاعدگی سے سخت نفرت تھی۔ چوٹی گوندھنے میں اگر مانگ میں ایک بال بھی ادھر کا ادھر ہو جاتا تو بے کل ہو جاتیں اور ساری رات تکیے پر سر پٹختیں۔ ان سے کبھی کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ سلگنے کی عادی تھیں، بھڑکنے کی شرط نہیں تھی۔ مگر غضنفر میاں ٹھہرے کل کے لونڈے۔ دھڑ دھڑ جلنے لگے۔ بھوک لگے کھا لو، پیاس لگے پی لو، نیند آئے سو جاؤ۔ انہوں نے یہی سیکھا تھا۔ بیگم کی حد بندیوں پر الف ہو گئے۔ نگاہیں کھینچیں تو اگاڑی پچھاڑی تڑانے لگے۔ چند مصاحبین کی رائے سے ادھر ادھر شکار کے لئے چل دیئے۔ بیگم کی دنیا اجڑ گئی۔ محل سرا میں موت سی ہو گئی۔ جاسوسوں نے خبر دی کہ صاحب زادے چوڑوں چماروں پر موتی رول رہے ہیں۔ ایک عدد موتی بہنجمی کی صورت میں الھڑ

کمہارن کی کوکھ میں جلوہ افروز ہوگیا۔ ولایت جانے کا وقت آگیا اور وہ رخصت ہوئے لیکن ہوائی جہاز کے حادثے میں ختم ہوگئے۔ بیگم نے برسوں چپکے چپکے ماتم کیا۔ اگر اس دن انہوں نے غضنفر میاں کو دھتکارا نہ ہوتا تو شاید یہ موتی ان کی پیاسی کوکھ کو سیراب کردیتا۔ یہ تو ان کی امانت تھی جس میں اب خیانت ہوگئی۔۔۔ تو کیا بجمی ان کی کوئی نہیں؟ کوئی رشتہ نہیں؟ کیا کسی کی مرغی جا کر دوسرے کے ڈربے میں انڈا دے آئے تو مرغی کے مالک کا اس پر حق نہیں رہتا؟ جینے کے لئے انسان کیسے کیسے ہتھکنڈے چلاتا ہے۔ محرومیوں اور تنہائیوں سے اکتا کر تخیل کی دنیا بسا لی۔ زخمی دل نے مرہم چاہا اور پا لیا۔۔۔ جیسے سیپی اپنے زخم کو موتی بنا کر سینے میں چھپا لیتی ہے۔

"لونڈی نے سوچا" آخر اپنا خون ہے۔ شاگرد پیشے میں نیچ کمینی عورتیں اسے کسی کرم کا نہیں رکھیں گی۔"

"ہاں اپنا خون ہے!" نواب بیگم کو یہ بات بڑی پیاری لگی۔ اوپر سے برسوں کی دبی دبائی ممتا پھٹ پڑی۔ انہوں نے بجمی کو اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔

بیگم بادشاہ زادی کی طرح بجمی کے بھاگ جاگ اٹھے۔۔۔ بجمی سے اسے شگفتہ بانو بنا دیا گیا۔ وہی باندیاں جو لہنگا اٹھا کر اس کی گت بنایا کرتی تھیں، آفتابہ، سلفچی سنبھالے اس کی خدمت گزاریاں کرنے لگیں اسے نہلاتیں دھلاتیں، کنگھی چوٹی کرتی، نواب بیگم کی رائے سے اسے گڑیا کی طرح سجاتیں۔ اور اس کی قسمت پر رشک کرتیں کہ کاش صاحب زادے ان کی ماؤں پر مہربان ہوئے ہوتے۔

شگفتہ بانو کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم اور تربیت ہونے لگی۔ سلیقہ سکھایا جاتا۔ وہ بڑی مستعدی سے ہر کام پہ جٹ جاتی۔۔۔۔ اسی طرح جیسے گاؤں میں خوشی خوشی اپلے تھاپا کرتی تھی۔ بنائی، کڑھائی سیکھتی۔ تیج تہوار پر محل سرا سجا کر دلہن بنائی جاتی۔ وہ باندیوں کے غول میں مل کر محل سرا سر پر اٹھا لیتیں۔ ساون میں جھولے پڑتے۔ دیوالی پر چراغاں ہوتا۔ محرم پر تعزیے رکھے جاتے، مجلس ہوتیں۔ رعیت میں اکثریت ہندوؤں کی تھی، مگر سب ہی تہوار دھوم دھام سے منائے جاتے۔ نواب

صاحب ہر تہوار کے جشن میں لازماً شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب کے حرم میں لونڈیوں باندیوں کے علاوہ سترہ اٹھارہ بیویاں بھی تھیں جو کبھی ان کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔ شرع کی رو سے چار شادیوں سے زیادہ نہیں کر سکتے تھے' جن میں سے نواب بیگم کو وہ طلاق نہیں دے سکتے تھے' کیوں کہ ان کے بھائی بہت بارسوخ اور طبیعت کے ٹیڑھے تھے' اس لئے ان کے علاوہ تین اور نکاح میں رہتیں۔ جب کوئی نئی دل میں بس جاتی تو تین میں سے جو سب سے زیادہ پرانی گھسی ہوتی اسے طلاق دے دیتے اور وہ روتی پیٹتی محل سرا میں پہنچا دی جاتی۔ اسے باہر جانے یا دوسری شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے روپے پیسے کی انہیں کوئی کمی نہیں تھی' بس مرد کی صورت کو ترستی تھیں۔ ہزار پابندیوں کے باوجود ادھر ادھر ٹھگی لگانے میں بھی کامیاب ہو جاتی تھیں نواب صاحب کے پیرومرشد کے حکم کے مطابق وہ سب بیویوں کے حقِ زوجیت باری باری سے بخشتے تھے۔ روز شام کو ایک بیوی کا بلاوہ آجاتا تھا۔ اس میں بڑے جوڑ توڑ چلا کرتے۔ بالا بالا رشوتیں چلتی تھیں۔ جو بیوی ذرا کنجوسی کرتی' اہل کار اس کی باری گڈمڈ کردیتے۔ نواب صاحب بے چارے کو تو ٹھیک طرح یاد بھی نہیں تھا کہ کون سی نکاح میں ہے'

کسی بات پر اچانک کسی پچھلی بیوی کی ہڑک اٹھنے لگتی تو نواب صاحب بے قرار ہو جاتے۔

"ارے بھئی آج نوری کو حاضر کیا جائے۔"

"عالی جاہ' ان کو تو طلاق فرما چکے۔"

"ماں نہیں۔۔۔ کب؟"

"سرکار' وہ تیسری بٹیا کے بعد جب فروزاں نواب سے عقد فرمایا تھا۔"

"اچھا اچھا۔" نواب صاحب کو یاد آجاتا' "کوئی مضائقہ نہیں' نمک خوار تو

ہے۔"

اور نمک خوار خوش خوش سولہ سنگھار کر کے آجاتی' اور ایسی پٹی پڑھاتی کہ احمق نواب بہادر نمبر 2 کو طلاق دے کر اس سے دوبارہ نکاح فرما لیتے۔ زیادہ تر نکاحوں کی وجہ یہ تھی کہ سب کم بخت نواب صاحب کو چڑانے کے لئے لڑکیاں ہی پیدا کرتی تھیں۔ تین چار لڑکے ہوئے بھی مگر جاتے رہے۔

محل سرا میں جب یہ جشن ہوتے تو نواب صاحب تشریف لاتے۔ دربار لگتا۔ انعامات تقسیم کئے جاتے۔ خلعتیں بٹتیں۔ اس دن ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر سنگھار کرتی' بڑی بیگم حضور اعلی حضرت کے دائیں طرف جلوہ افروز ہوتیں' باقی تین میں سے سب سے چہیتی بائیں طرف' اس کے بعد سب درجہ بدرجہ بیٹھتیں جشن سے پہلے بڑے دنگے فساد ہوتے۔ بیویاں آنے والے دن کی تیاریوں میں اپنے مرتبے کا بہت خیال رکھتیں۔ چھپی ڈھکی نوک جھونک چلتی۔ کبھی ان موقعوں پر کوئی پرانی بیوی ایک دم سے نئی لگنے لگتی اور اس کا نام پھر چار بیویوں کی فہرست میں آجاتا۔ باری مقرر کرنے کا کام مشیر قانونی کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ کچھ خانم صاحب پر بھی دارومدار تھا۔ وہ اگر کہہ دیتیں کہ طبیعت کسل مند ہے تو بے چاری کی باری غائب ہو جاتی۔ ان کے بھی مسکہ مارنے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔

میرے خیال میں بجمی کی کہانی دراصل ہولی کے تہوار سے شروع ہوئی یہ ہولی تھی بھی پچھلے سارے تہواروں سے زیادہ شان دار۔ اس دھوم دھام کی وجہ یہ تھی کہ ریاست میں کانگریس کا اثر 1935ء کے بعد سے بہت بڑھ گیا تھا۔۔۔ کانگریس جو بدیسی راج کا ناک میں دم کئے ہوئے تھی اور برٹش راج کے فرزندانِ دل بند میں سے نواب صاحب بھی تھے۔ کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس وجہ سے بھی کچھ خائف رہتے تھے۔ اسی کی خاطر شادیوں پر شادیاں کر رہے تھے' اور ابھی ناامید ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کانگریس کے زور کو کچلنے کے لئے ریاست میں ہندو مسلم کشیدگی کا بیج بویا گیا' جو فوراً "جڑ پکڑ گیا" لیکن خود نواب صاحب پر بھی فرقہ پرستی کی شہ پڑنے لگی۔

خود نواب صاحب قطعی فرقہ پرست نہیں تھے' انہیں خود پرستی سے ہی چھٹی نہیں ملتی تھی جو فرقہ پرستی کے جھنجھٹ میں پڑتے۔ ناچ رنگ اور شکار سے اگر کبھی مہلت مل جاتی تو برٹش راج کی سلامتی کی فکر کر ڈالتے۔ انہیں ہر فرقے کے لوگوں سے بے انتہا پیار تھا' اور ہر فرقہ ان کی ریاست میں اطمینان سے اپنے دھرم کا پالن کر سکتا تھا۔ مسلمان اور ہندو میں وہ کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ دونوں ہی ان کے راج میں قلاش تھے' بلکہ مارواڑیوں نے تو کچھ فیکٹریاں بنا بھی لی تھیں' مسلمان بے انتہا جاہل اور مفلس تھے۔ عہدہ داروں میں وہ انگریز کے بعد ہر اس شخص سے مرعوب تھے جو سرکاری قبیلے کا تھا اور پنشن کے بعد ان کی ریاست کی قسمت جگانے آجاتا تھا۔ محبت کے معاملے میں وہ انتہائی غیر جانب دار تھے۔ بیویوں میں نہایت اطمینان بخش طریقے سے انہوں نے بغیر کسی تفریق کے سب کو نوازا تھا۔

کچھ پروپیگنڈے کی کاٹ منظور تھی' کچھ پرانا دستور تھا' ٹیسو کے پھول دیگوں میں ابال کر رنگ تیار ہوا۔ ابرق ملا' عنبر اور گلال بڑے بڑے پیتل کے تھالوں میں بھر کر چبوتروں پر سجا دیا گیا تھا۔ رنگوں کی بھری ناندیں اور پچکاریاں افراط سے موجود تھیں۔ کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ حلوائی پکوان تل رہے تھے اور کہار ڈولیوں میں رکھ رکھ کر محل سرائیں پہنچا رہے تھے۔ ساری خلقت رنگ کھیلنے اور انعام لینے کے لئے ٹوٹی پڑتی تھی۔ کمینوں کی ٹولیاں سوانگ بھرے ناچتی گاتی چلی آرہی تھیں۔ محل سرا کے لق و دق صحن میں ریاست کے اعلیٰ افسروں کی عورتیں' شاہی خاندان کی بہو بیٹیاں ہولی کھیلنے اور ترمال اڑانے میں مشغول تھیں نواب بہادر بھی محفل کی رونق بڑھانے کی خاطر تھوڑی دیر کو جلوہ افروز ہو جاتے۔ رعیت کے مائی باپ تھے' ان سے کوئی پردہ نہیں کرتا تھا' سب کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرتے' رنگ ڈلواتے' اور آنکھیں بھی سینکنے سے باز نہ آتے۔۔۔

ان موقعوں پر لونڈیوں باندیوں کی خرمستیاں قابل دید ہوا کرتی تھیں خوب ناچ' گانے' سوانگ اور کشتم پچھاڑ ہوتی۔ مقصد نواب بہادر کی توجہ پانا ہوتا۔ ایسے

ہی موقعوں پر تو لونڈیوں کو بیگمیں بننے کے موقعے ملا کرتے تھے۔

روک ٹوک کے باوجود بجمی عرف شگفتہ بانو اس طوفان رنگین میں بجلی بنی چمک رہی تھی۔ سڑاندی کیچڑ اور گوبر سے کھیلنے والی بجمی کی یہ پہلی رنگ برنگی مہکتی ہولی تھی۔ پندرھواں سال لگا ہی تھی، مگر جسم کی اٹھان ماہ و سال کا جھنجھٹ نہیں پالتی۔ رنگوں سے بھیگے کپڑے جسم سے چمٹ کر رہ گئے تھے۔ قوس و قزح بنی ادھر ادھر قلانچیں لگا رہی تھی۔ نواب بہادر کے نتھنے پھڑکے "مانس گند مانس گند"۔

نواب بیگم نے ان بڑی بڑی غلافی آنکھوں کی نیت پہچان لی۔۔۔۔ نواب بہادر کی ننگی آنکھوں کی گالی پر وہ تلملا اٹھیں۔ انہوں نے جھک کر خانم صاحب کے کان میں کچھ کہا۔

ادھر نواب بہادر نے جھک کر خواجہ سرا کے کان میں کچھ کہا اور اٹھ گئے۔

عیش باغ کے مرمریں حوض میں لال مچھلی طرارے بھر رہی تھی۔ اس کے آس پاس کے پانی میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ نواب بہادر کی بھاری بھاری آنکھیں رس گھول رہی تھیں۔ بجمی عرف شگفتہ بانو نے عیش باغ کی اونگھتی اکتائی فضا کو ایک دم جھنجوڑ کر جگا ڈالا۔ نواب بہادر کی تھکی تھکائی آنکھیں ایک دم چونک کر ٹھٹھے مارنے لگیں۔ یہ چٹپٹی تتیا مرچ کس مرتبان میں سینتی پڑی تھی؟ ان کا کام و دھن تو اکتاہٹ کے پھپوند سے اٹھ رہا تھا۔ ایسی بے عذر، بے تکلف شے ان کے شاہی دستر خوان پر آج تک نہیں اتری تھی۔ سب ہی کٹی بسی کپڑچھن کی ہوئی معجون مرکب بنی ان کے حضور تک پہنچی تھیں۔

نواب بہادر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر ہوگئے جب گریبان میں ہاتھ ڈالنے پر اس نے چٹ سے ہاتھ پر تھپڑ نکایا اور پھنکارنے لگی۔

"واہ!" بے اختیار ان کے موہنہ سے نکلا "ارے بھئی، ادھر آؤ"۔ انہوں نے مصاحبین کو دعوت دی۔ "ذرا اسے تو دیکھو۔" انہوں نے پھر وہی حرکت کی، اور شگفتہ بانو نے اب کے پیر سے جوتی نکال کے ہاتھ پر رسید کی۔ "بدمعاش!" ساتھ ہی خطاب بھی عطا فرما دیا۔ یہ حرکت اب تک اس سے کسی مرد نے نہیں کی

تھی۔

مصاحبین کے دلوں کی حرکت بند ہوتے ہوتے بچی۔ مگر نواب صاحب بہادر نے سر پیچھے جھٹک کر فرمائشی قہقہہ لگایا اور مصاحبین معاملے کی اہمیت کو سمجھ گئے۔ نواب بہادر اتنا ہنسے کہ من من بھر کی آنکھیں سوائی ہو گئیں۔ پھر چاروں طرف سے ہاتھ چلنے لگے اور جوتی چو مکھی مدافعت کرنے لگی۔ اس کی اجڈ قسم کی گالیوں کو سننوں میں بھی بلا کی حلاوت تھی۔ پھر وہ تنتنا کے کھڑی ہو گئی۔ "ہم جاتے ہیں ہاں!" اس نے غرور سے اعلان کیا۔

"اچھا بیٹھو بیٹھو۔ اب نہیں چھیڑیں گے۔" نواب بہادر نے پچکارا۔

"شہزادیوں جیسے دماغ ہیں۔" دل میں سوچا۔

نواب بیگم غیض و غضب کی دیوار بنی پوری محل سرا پر برس رہی تھیں تین بار دورہ پڑ چکا تھا کلیجے میں جوالا مکھی دہک رہا تھا۔۔۔ لونڈیاں باندیاں سوکھے پتوں کی طرح لرز رہی تھیں۔ خانم صاحب دست بستہ مجرموں کی طرح قدموں میں سر رکھے دے رہی تھیں۔

"کیسے لے گئے؟" انہوں نے خانم صاحب کی چوٹی مروڑ ڈالی۔

"کیا عرض کروں' ایک جھلک تو میں نے دیکھی' پھر جیسے بجلی سی کوندی' جیسے زمین پھٹی اور وہ سما گئی۔ یا آسمان سے غیبی ہاتھ اترا اور اڑا لے گیا۔ کسی نے جان بوجھ کر میری آنکھوں میں عبیر جھونکا تھا' ورنہ بندی یوں حواس باختہ نہ ہو جاتی۔ اور جب میں نے آنکھیں مسل کر کھولیں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ ڈیوڑھی پر کسی نے دھیان بھی نہ دیا ہو گا' نہ چیخی نہ چلائی۔"

"اب کیا ہو گا خانم؟" نواب بیگم ایک دم بہہ نکلیں۔

"باقر ابھی خبر لے کر آیا ہے' چہلیں ہو رہی ہیں۔ لیکن میری سرکار بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔"

"یہ کسی دن بھی نہیں ہونا ہے؟" بیگم تمتا اٹھیں۔

سونے کا ڈلہ بنی بجمی مینا کی طرح چہک رہی تھی۔ اس نے حاضرین کی تمام

انگوٹھیاں جیت کر پور پور پر نکالی تھیں۔ اب اشرفی کا کھیل ہو رہا تھا کھلاڑیوں میں سے ایک اسے اشرفی چٹکی میں پکڑ کر دکھاتا اور جب وہ اشرفی لینے لپکتی تو چٹکی کھل کر اشرفی کھلاڑی کی گود میں ڈوب جاتی۔ بجمی اشرفی کی کھوج میں ہاتھ مارتی اور مغلظات میں لتھڑے ہوئے قہقہے گونجنے لگتے۔ وہ بڑی بڑی حیران آنکھیں کھول کر ہنسنے والوں کو دیکھتی۔ مہذب قسم کے اونچے مذاق اس کی سمجھ سے اوپر نکل جاتے' یہ ناسمجھی ہی تو سارا لطف پیدا کر رہی تھی۔ جب کوئی انتقام لینے کا قصد کرتا تو وہ جوتی سنبھال لیتی' اور محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی۔

نواب بہادر تو روز ہی رت جگا کرتے تھے۔ جب پو پھوٹنے لگتی تو ہنگن بائی بھیرویں کے مقدس سروں میں کوئی غزل یا ٹھمری چھیڑ دیتیں اور سرکار کی رگوں میں نیند اتر آتی۔ جگانے کا راگ ان کے کانوں میں لوری بن جاتا۔ مگر آج بجمی کی شوخیوں نے محفل جمنے ہی نہ دی دن بھر کی جھنجوڑی ہوئی تو تھی' سرچوکی کے پائے لگا تو پٹ سے سو گئی۔

ایک دم محفل پر سناٹا چھا گیا۔ بارہ دری میں ایک ایک کر کے سب شمعیں گل ہو گئیں۔ شبنمی پردے چھوٹ گئے۔ بظاہر تخلیہ ہو گیا۔ بجمی نے ڈھیلی انگوٹھیوں کو گرنے سے روکنے کے لئے مٹھیاں باندھ کر تھوڑی کے نیچے رکھ لی تھیں۔ نواب بہادر نے اپنا بھاری پیر اس کی چھاتی پر دھر کے جگانا چاہا' مگر وہ مردے کی طرح بے ہوش پڑی رہی۔ انہیں اس کی یہ گستاخی بڑی پسند آئی۔ جیسے بھوکے کو ہبڑ ہبڑ کھاتے دیکھ کر بھوک لگنے لگتی ہے' اسی طرح بجمی کی الھڑ نیند کا جادو ان پر بھی چلنے لگا۔ برسوں بعد وہ سحر سے کئی گھنٹے پہلے وہیں مسند پر ڈھیر ہو کر سوئے۔

دستور کے مطابق اعلیٰ حضرت کے بیدار ہونے سے پہلے ہی بارہ دری کی صورت بدل گئی۔ رات کے مسلے ہوئے پھول مع بجمی کے جھاڑ دئے گئے' دبیز پردے چھوڑ کر بالکل بند کمرہ بنا دیا گیا۔

جب بجمی سر سے پاؤں تک سونے اور جواہرات میں ڈوبی' آنچل میں اشرفیوں کے توڑے اور پور پور انگوٹھیاں پروئے نواب بیگم کے حضور میں پیش کی

گئی تو وہ آنکھوں پر کہنی کا تکون کھڑا کیے بے کل سی پڑی تھیں بجمی نے چھنکتا ہوا مجرا کیا تو آنکھیں کھول کر دیکھا اور تڑپ کر اٹھ بیٹھیں۔ بجمی ان کے لاڈ پیار کی ایسی عادی ہو چکی تھی کہ اس نے ان کے تیور نہ دیکھے۔ اپنی دھن میں رات کے طوفانوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ وہیں ان کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔

بیگم نواب نے چوٹی پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا' پھر ان کے ہاتھ کانٹوں کی طرح اس کے وجود کو کھرچنے لگے۔ ایک ایک زیور انہوں نے پیروں تلے مسل ڈالا۔ کپڑے تار تار کر دیے اور پھر اتنے طمانچے لگائے کہ ان کے ہاتھوں میں خون چھلک آیا۔ پھر لات مار کر انہوں نے اسے دور گرایا اور ان پر ہسٹریا کا شدید دورہ پڑ گیا۔

جب خانم صاحب نے آکر اطلاع دی کہ شگفتہ بانو ویسی ہی ثابت لوٹ آئی ہے جیسی گئی تھی تو وہ دوبارہ زندہ ہو گئیں۔ انہوں نے اسے بلا کر اس کے سوجے ہوئے مکھڑے پر اپنے نرم ریشم جیسے ہاتھ پھیرے۔ صندوقچہ منگا کر ان سے دوگنی دے دیں۔ اپنا ڈھیروں زیور اپنے ہاتھوں سے پہنایا' اور ڈھیٹ بجمی کھی کھی ہنسنے لگی۔

بڑی دیر تک خانم صاحب سے سر جوڑ کر مسکوٹ ہوتی رہی کہ اگر شام کو سرکار نے اسے پھر یاد فرمایا تو کیا بہانہ بنایا جائے۔ نسوانی مجبوری کا بہانہ چند روز چل جائے گا۔ پھر کیا ہو گا---- دیکھا جائے گا۔

شام ہوئی اور سرکاری موٹر آدھمکی۔ بیگم نے فروزاں کو' جو انہیں بے حد پیاری تھی' بنا سنوار کر روانہ کر دیا۔ اسے ہر طرح کی تاکیدیں کر دی گئیں مگر فروزاں الٹے پیروں روتی پیٹتی آگئی۔

نواب بہادر کسی جھانسے میں آنے کو تیار نہیں تھے۔

اسی دم اعلان جنگ ہو گیا۔ نواب بیگم نے کھلی بغاوت پر کمر باندھ لی۔ چاہے حشر ہو جائے' مگر وہ اپنے اعلیٰ خاندان کے مقدس خون کو موری میں لنڈھانے کو تیار نہیں۔ پہلے تو سوال و جواب دونوں طرف سے اہل کاروں کے ذریعہ چلتے رہے۔ نواب بہادر بیگم نواب کو سمجھا سمجھا کر ہار گئے مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہیں۔ نواب

بہادر نے ان کے خون کی عزت افزائی کی غرض سے نکاح کے قصد کا بھی ذکر فرمایا۔ مگر نواب بیگم ٹس سے مس نہ ہوئیں--- مصاحبین نہ جانے کیا کیا جتن کر کے سرکار کو بہلائے ہوئے ہوتے، مگر ببمی کے بغیر شام ان پر بڑی بھاری گزر رہی تھی۔ عشا کی نماز کے بعد تو نواب بہادر بالکل ہی بکھر گئے نواب بیگم کے زیادہ تر جواب ان کے کانوں تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ بس طرح طرح کے بہانے بنائے جارہے تھے۔ کسی میں اس گستاخی کی ہمت نہ تھی۔ بدکے ہوئے گھوڑے کو طرح طرح بہلایا جارہا تھا۔

وہ تو خیریت یہ ہوئی تھی کہ نواب بہادر کو ببمی کا نام نہیں یاد رہا تھا۔ وہ بس تڑپ تڑپ کر اس کی تفصیل بتاتے تھے:

"حرام زادو! وہ جو ننھی سے جوتی دکھا رہی تھی، جس نے تھوک دیا تھا-- وہی۔" وہ احمقوں کی طرح بتاتے اور مصاحبین نہایت مستعدی سے فوراً" تعمیل حکم کے لئے دوڑتے اور جوتی والی کی بجائے کسی اور آفت کی پرکالا کو پکڑ کر حاضر خدمت کردیتے۔ نواب بہادر چمچماتی ہوئی بوجھل آنکھوں سے اسے دیکھتے اور پھر دہاڑنے لگتے۔

عیش باغ میں ایک قیامت برپا تھی۔ سب کے سروں پر موت منڈلا رہی تھی۔ طرح طرح کے جھنجھنے بجائے گئے بندر نچائے گئے مگر اعلیٰ حضرت کسی جھسے میں آنے کو تیار نہ تھے۔ نام انہیں کبھی کسی عورت کا یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے یاد رہ جاتے تھے۔ لوگوں نے انہیں بے وقوف بنانے کی بھی کوشش کی۔

"اے قربانت شوم حضور والا، کل تو طرفہ ہی حاضر خدمت ہوئی تھی۔"

"طرفہ کو حاضر کیا جائے۔" وہ دہاڑتے۔ مگر جب اینڈتی بل کھاتی طرفہ ان کی آغوش میں انڈیلی گئی تو وہ بے حساب دولتیاں جھاڑنے لگے۔ طرفہ اور اس کے لواحقین کی خوب جوتے کاری ہوئی۔ اور وہ پھر ببمی کے لئے ایڑیاں رگڑنے لگے۔

جب سب کی جان سولی پر ٹنگ گئی تو انجام کار اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ

رہا کہ اصل صورت حال سے نواب بہادر کو آگاہ کیا جائے۔ جب حضور والا کو معلوم ہوا کہ وہ فتنہ روزگار علیا حضرت نواب بیگم کی نہایت چہیتی مونہہ بولی بیٹی ہے اور شاہی خاندان سے ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک کر رہ گئے۔ نواب بیگم کے مائیکے سے وہ کنی کاٹتے تھے۔ ان کے دونوں سالے انتہائی خون خوار قسم کے تھے۔ مگر پھر خودداری اڑنے لگی۔ اچھا تو نواب بیگم سے ٹکر ہے۔ دماغ پر بہت زور ڈالا بیگم کی کوئی واضح صورت یاد نہ آئی--- برسوں کی بات تھی بیگم' نہ جانے کتنے سال سے ان پر بھرپور نظر ڈالنا ہی چھوڑ دی تھی۔ جشن جلوس کے موقع پر وہ پتھر بنی ان کے پہلو میں بیٹھی رہتیں' اور نواب بہادر کی نظریں بادہ پیمائی میں مصروف رہتیں۔

جب نواب بہادر کی سواری پہنچی تو بیگم نواب کا دل بری طرح بھڑک رہا تھا۔ نواب دولہا بارات لے کر آئے تھے تب بھی اس طرح دل نہیں دھڑکا تھا۔ یوں بھی بڑا فاصلہ تھا ان دو دھڑکنوں میں۔ بارات کے وقت ارمانوں اور امنگوں کی شہنائیاں بھی تو ہم آہنگ تھیں۔ آج صرف نفرت اور حقارت کا طوفان کھول رہا تھا۔

"جان من' ایک فضول اور بے بنیاد قسم کے وہم کی بنا پر آپ ہماری دل شکنی پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جتنے کالے میرے باپ کے سالے۔ ریاست کے سارے حرامی پلوں سے آپ کا خون کا رشتہ جوڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں تو اتنا سمجھ لیجئے کہ ہم بھی اپنی ضد کے پکے ہیں۔ بات اتنی بڑھ گئی ہے کہ آپ کی ہٹ دھرمی ہماری سبکی کا باعث ہو رہی ہے۔"

"حضور یقین فرمایئے۔ میں مجبور ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بیگم نے ادب سے سر جھکا کر کہا۔" یہ لونڈی کا وہم نہیں حقیقت ہے ولایت سدھارنے سے پہلے غضنفر میاں نے التجا کی تھی---- خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" یہ نکتہ بڑے سوچ بچار کے بعد خانم صاحب نے انہیں سمجھایا تھا۔

"واللہ' مذاق فرما رہی ہیں بیگم۔ ارے وہ کم سن نازک اندام چھوکرا۔ ہٹایئے بھی وہ تو خود ہی معشوق تھا۔

"قطع کلامی ہوتی ہے سرکار، مگر مرحوم کی شان میں ایسے کلمے آپ جیسے باوقار حاکم کو زیب نہیں دیتے۔" بیگم کی آنکھوں میں لاوا کھدبدانے لگا۔

"ہمارا مطلب ہے، وہ تو خود ہی بچہ تھے، مِس بھی تو نہ بھیگی ہوں گی۔۔۔ یہ ہوائی جہازوں کا سفر، توبہ توبہ!" نواب صاحب فوراً ڈھیلے پڑ گئے۔ "خیر بیگم ضد چھوڑیئے اور۔۔۔"

"قبلہ عالم، یہ مرنے والے کی آخری وصیت کا سوال ہے۔ ان کی روح کو چین نصیب نہ ہوگا۔ میں حشر میں انہیں کیا مُنہ دکھاؤں گی۔"

"ہم جانتے ہیں کہ یہ سب ہمیں زک پہنچانے کے لئے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں۔" نواب صاحب جھلا اٹھے۔ "اور پھر ہم اسے باندی نہیں بنا رہے ہیں۔ ہم اسے نکاح میں لائیں گے۔" نواب صاحب ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔

"نکاح؟ میں نے اسے بیٹی کہا ہے، اور وہ میری بیٹی ہے۔ آپ کی بھی بیٹی ہوئی، یہ گناہ عظیم!" بیگم کی آنکھوں میں شرارے لپکنے لگے۔ "نکاح جائز نہ ہوگا۔"

"لاحول ولا قوہ! یہ کس مردود کا فتویٰ ہے؟ کیوں ستا رہی ہیں بیگم؟ آپ نے بیٹی کہا تو وہ ہم پر حرام ہوگئی؟ کون سی شریعت کے حکم سے؟"

"میری زبان کے قول کا پاس آپ پر بھی اتنا ہی واجب ہے جتنا مجھ پر۔" لاوا کھدبدانے لگا۔ "اس سے نکاح فرمانے کے لئے مجھے طلاق دینا ہوگی۔"

"آپ جانتی ہیں بیگم ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ کے برادر عزیز ہمارے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔ سچی بات کہئے بیگم، اس بڑھاپے میں بھی سوتیا ڈاہ ۔۔۔"

"توبہ کیجئے حضور۔ اگر گلی پچھلی سوتوں کا ڈاہ کرتی تو بندی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ نہ ہوگا۔"

"یہی ہوگا۔" نواب بہلول اپنے پورے جلال سے کھڑے ہوگئے "آج شام کو بعد نماز مغرب۔"

"عالی جاہ، ایسا ظلم نہ کیجئے۔ آپ کو کیا کمی ہے؟ میری سونی گود کا مان کیجئے۔"

"بیگم ہمیں اتنا ذلیل نہ کیجئے' ایک چھوٹے سے وہم کی خاطر ہمارا دل چکنا چور کئے دیتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں اس کی رگوں میں آپ کا خون ہے۔ ہم اس کا مان کر رہے ہیں۔ ہم نکاح کریں گے۔ اور اگر خدائے برتر کی عنایت و مہربانی سے اس کے بطن سے نرینہ بچہ پیدا ہوا تو ہماری دیرینہ مراد بر آئے گی وہ ہمارا ولی عہد ہو گا۔"

"کمال فرماتے ہیں عالی جاہ' کل تو وہ مصاحبوں اور پاپوش برداروں کے لاشے جگا رہی تھی۔ چوب دار اس کی بوٹیاں مسل رہے تھے تیری میری گود میں ہمک رہی تھی آج اسے نکاح کا مرتبہ عطا فرما رہے ہیں!" بیگم باز نہ آئیں۔

کل کی رنگ برنگی یاد قہقہہ بن کر نواب بہادر کے حلق سے چھلک گئی۔ "قہر ہے بیگم! ایک قیامت ہے! ظالم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔۔۔ کہاں ہے؟ ذری بلوایئے تو اپنی لاڈلی کو۔ اچھا رہنے دیجئے۔۔۔۔ یہ ہجر کے لمحے بھی بڑے مزہ دار ہیں۔ کیا ہم ایک نظر دیکھ بھی نہیں سکتے؟ اللہ قسم دور سے' بس' ہاتھ نہ لگائیں گے۔" مگر بیگم کی آنکھوں میں ابلتے ہوئے طوفان نے ان کی زندہ دلی پر اوس ڈال دی۔

"یہ عمر' اس پر چونچلے۔" مگر نواب بہادر سنی کو ٹال کر رخصت ہو گئے۔

اگر خانم صاحب نہ سمیٹ لیتیں تو بیگم نواب ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ انہیں سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ کلیجہ تھام کر وہیں ڈھیر ہو گئیں اور کٹی مرغی کی طرح فرش پر لوٹنے لگیں۔

"یہ نہیں ہو گا۔ ہر گز نہیں ہو گا' میرے جیتے جی نہیں ہو گا۔"

"نہیں ہو گا' قربان جاؤں میری شہزادی' نہیں ہو گا۔" خانم صاحب کی آنکھوں میں سورج جگمگا اٹھے۔

دالان در دالان میں زرنگار جوڑوں اور زیورات کے تھال یہاں سے وہاں تک چنے ہوئے تھے۔ باندیاں بنہ چھمی عرف شگوفہ بانو کو دھو پھٹک کر عطر کے پانی میں بسا رہی تھیں۔ مہندی رچے لال لال تلوے اور ہتھیلیاں دیکھ دیکھ کر چھمی کلکاریاں مار رہی تھیں۔ اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ جب دلہن سج دھج کر تیار ہو گی تو چھم چھم

کرتی نواب بیگم کی قدم بوسی کو حاضر ہوئی۔ انہوں نے بڑی حسرت سے اسے سر سے پیر تک نہارا۔ ایک ترشول سا کلیجے میں اترتا چلا گیا۔ غضنفر علی خاں کے عکس پر ایک اور ننھی سی تصویر سپرامپوز ہو گئی۔

ایک نہ سہی دو گھاؤ سہی۔ جب دل ہی قیمہ ہو چکا ہو تو نئے اور پرانے سب ہی زخم ایک ہو جاتے ہیں۔ پاس بٹھا کر نواب بیگم نے اسے بڑے پیار سے چھوا۔ دماغ میں طوفان کھولنے لگا۔ خانم صاحب نے مٹھائی کی طشتری پیش کی' انہوں نے بچی کا منہ میٹھا کرایا' بدنصیب سسرال جانے کے لئے بے قرار تھی۔

جب جھمی دلہناپے کے نشے میں جھومتی چلی تو اس کے پاؤں بہکے بہکے پڑ رہے تھے۔ گنگا جمنی جھما جھم کرتی پالکی میں جب وہ سوار ہوئی اور سرخ شبنمی پردے چھوڑ دئے گئے تو ساری محل سرا کی لونڈیوں کے کلیجوں پر سانپ لوٹ گئے۔ بیگم نے اپنی کہنی کا تکون بنا کر آنکھوں پر کھڑا کر لیا اور سسکنے لگیں۔

بڑی دھوم دھام سے دلہن کی سواری دولہا کی چوکھٹ پر پہنچی --- پالکی بیچ بارہ دری میں رکھ دی گئی۔ نواب صاحب کا دل مست ہرن کی طرح قلانچیں بھر رہا تھا۔ کم سن دولہاؤں کی طرح ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ بس اب کوئی دم میں شبنمی بادلوں کے درمیان سے بجلی تڑپ کر نکلے گی اور خرمن ہستی کو پھونک دے گی۔

مہریوں نے پردے اٹھائے --- نہ بجلی تڑپی' نہ شعلہ لپکا۔

ڈھیلی انگوٹھیوں کو اترنے سے روکنے کے لئے اس نے کس کے مٹھیاں بھینچ لی تھیں سکڑی سمٹی پالکی کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی' جیسے اچانک پل بھر کے لئے اونگھ گئی ہو' اور ابھی جاگ پڑے گی!

مغل بچہ

وہ مرتے مر گیا مگر مغلیہ شہنشاہیت کی ضد کو برقرار رکھا۔

فتح پور سیکری کے سنسان کھنڈروں میں گوری دادی کا مکان پرانے سوکھے زخم کی طرح کھٹکتا تھا۔ لگیا اینٹ کا دو منزلہ گھٹا گھٹا سا مکان ایک مار کھائے روٹھے ہوئے بچے کی طرح لگتا تھا۔ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا وقت کا بھونچال اس کی ڈھٹائی سے عاجز آکر آگے بڑھ گیا اور شاہی شان و شوکت پر ٹوٹ پڑا۔

گوری دادی سفید جھک چاندنی بچھے تخت پر سفید بے داغ کپڑوں میں ایک سنگ مرمر کا مقبرہ معلوم ہوتی تھیں۔ سفید ڈھیروں بال، بے خون کی سفید دھوئی ہوئی ململ جیسی جلد، ہلکی کرنجی آنکھیں جن پر سفیدی رینگ آئی تھی، پہلی نظر میں سفید لگتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی تھیں۔ جیسے بسی ہوئی چاندنی کا غبار ان کے گرد معلق ہو۔

نہ جانے کب سے جئے جا رہی تھیں۔ لوگ ان کی عمر سو سے اوپر بتاتے تھے۔ کھلی گم سم بے نور آنکھوں سے وہ اتنے سال کیا دیکھتی رہی تھیں۔ کیا سوچتی رہی تھیں کیسے جیتی رہی تھیں۔ بارہ تیرا برس کی عمر میں وہ میری اماں کے چچا دادا سے بیاہی تو گئی تھیں مگر انہوں نے دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔ کنوار پن کی ایک صدی انہوں نے انہی کھنڈروں میں بتائی تھی۔ جتنی گوری بی سفید تھیں اتنے ہی ان کے دولہا سیاہ بھٹ تھے۔ اتنے کالے کہ ان کے آگے چراغ بجھے! گوری بی بجھ کر بھی دھواں دیتی رہیں۔

سرِ شام کھانا کھا کر جھولیوں میں سوکھا میوہ بھر کے ہم بچے لحافوں میں بدک کر

بیٹھ جاتے اور پرانی زندگی کی ورق گردانی شروع ہو جاتی بار بار سن کر بھی جی نہ بھرتا۔ اوبدا کر گوری بی اور کالے میاں کی کہانی دہرائی جاتی۔ بچارے کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ اتنی گوری دلہن کا گھونگٹ بھی نہ اٹھایا۔

اماں سال کے سال پورا لاؤ لشکر لے کر میکے پر دھاوا بول دیتیں۔ بچوں کی عید ہو جاتی فتح پور سیکری کے پراسرار شاہی کھنڈروں میں آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے جب شام پڑ جاتی تو کھوئی کھوئی سرمئی فضا سے ڈر لگنے لگتا۔ ہر کونے سے سائے لپکتے۔ دل دھک دھک کرنے لگتے۔

"کالے میاں آ گئے۔" ہم ایک دوسرے کو ڈراتے۔ گرتے پڑتے بھاگتے اور لکیا اینٹ کے دو منزلہ مکان کی آغوش میں دبک جاتے۔ کالے میاں ہر اندھیرے کونے میں بھوت کی طرح چھپے محسوس ہوتے۔ بہت سے بچے مرنے کے بعد حضرت سلیم چشتی کی درگاہ پر ماتھا رگڑا۔ تب گوری بی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک گوری بی بڑی ضدی تھیں۔ بات بات پر اٹوائی کھٹوائی لے کے پڑ جاتیں۔ بھوک ہڑتال کر دیتیں گھر میں کھانا پکتا، کوئی منہ نہ جھٹالتا جوں کا توں اٹھوا کر مسجد میں بھجوا دیا جاتا گوری بی نہ کھاتیں تو اماں باوا کیسے نوالہ توڑتے۔

بات اتنی سی تھی کہ جب منگنی ہوئی تو لوگوں نے مذاق میں پھبتے کیے۔

"گوری دلہن کالا دولہا۔"

مگر مغل بچے مذاق کے عادی نہیں ہوتے۔ سولہ سترہ برس کے کالے میاں اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ جل کر مرنڈا ہوتے رہے۔

"دلہن میلی ہو جائے گی خبردار یہ کالے کالے ہاتھ نہ لگانا۔"

"بڑے نازوں کی پالی ہے تمہاری تو پرچھائیں پڑی تو کالی ہو جائے گی۔"

"بڑا تیہا ہے ساری عمر جوتیاں اٹھوائے گی۔"

انگریزوں نے جب مغل شاہی کا انتم سنسکار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہی زیادہ عہدے سنبھالے بیٹھے تھے۔ جاہ جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ

کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔ بڑی بڑی ڈھندار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے۔ بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔

تب ہی مغل بچے اپنے غرور اور خودداری کی تار تار چادر میں سمٹ کر اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے گئے۔ مغل بچے اپنے محور سے کچھ کھسکے ہوئے ہوتے ہیں۔ کھرے مغل کی یہی پہچان ہے کہ اس کے دماغ کے دو چار پیچ ڈھیلے یا ضرورت سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں۔ عرش سے فرش کی طرف لڑھکے تو ذہنی توازن ڈگمگا گئے۔ زندگی کی قدریں غلط ملط ہو گئیں۔ دماغ سے زیادہ جذبات سے کام لینے لگے۔

انگریز کی چاکری لعنت اور محنت مزدوری کی کسرِ شان جو کچھ اثاثہ بچا اسے بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ ہمارے ابا کے چچا روپیہ پیسہ کہ جگہ چچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پتر اکھیڑے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد ٹکے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پان دان کی کلھیاں سل بٹے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائین توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا، یا محلّے کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔

کالے میاں نے دوستوں کی چھیڑ خانی کو جی کا گھاؤ بنا لیا جیسے موت کی گھڑی نہیں ٹلتی ویسے ہی باپ ماں کی طے کی ہوئی شادی نہ ٹلی۔ کالے میاں سر جھکا کے دولہا بن گئے۔ کسی سرپھری نے عین آرسی مصحف کے وقت اور چھیڑ دیا۔

"خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا، کالی ہو جائے گی۔"

مغل بچہ چوٹ کھائے ناگ کی طرح پلٹا، سر سے بہن کا آنچل نوچا اور باہر چلا گیا۔

ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک ماتم برپا ہو گیا۔ مردان خانہ میں اس ٹریجڈی کی خبر ہنسی میں اڑا دی گئی بغیر آرسی مصحف کے رخصت ایک قیامت تھی۔

"بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچہ سے واسطہ ہے۔" کالے میاں پھنکارے۔

کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے۔ دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھیں۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گڑی مڑی ہو گئی۔

"ہم کہتے ہیں گھونگٹ اٹھاؤ۔" کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔

سہیلیوں نے تو کہا تھا۔ دولہا ہاتھ جوڑے گا پیر پڑے گا پر خبردار جو گھونگٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے اتنی ہی زیادہ پاکباز۔

"دیکھو جی تو نوابزادی ہو گی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگٹ اٹھاؤ۔ ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں۔"

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جودھپور دندنا گئے۔

گھر میں سنوتا پڑا تھا۔ ایک اکائی جو دلہن کے ساتھ آئی تھیں جاگ رہی تھیں۔ کان دلہن کی چیخوں کی طرف لگے تھے۔ جب دلہن کے کمرے سے چوں بھی نہ آئی تو ان کے تو پیروں کا دم نکلنے لگا ہے ہے کیسی بے حیا لڑکی ہے۔ لڑکی جتنی معصوم اور کنواری ہو گی اتنا ہی زیادہ دند مچائے گی۔ کیا کچھ کالے میاں ٹیں کھوٹ ہے۔ جی چاہا کوئیاں میں کود کے قصہ پاک کریں۔

چپکے سے کمرے میں جھانکا تو جی سن سے ہو گیا۔ دلہن جیسی کی تیسی دھری تھی اور دولہا غائب۔

بڑے غیر دلچسپ قسم کے ہنگامے ہوئے تلواریں کھنچیں بڑی مشکل سے دلہن نے جو بیتی تھی کہہ سنائی۔ اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ خاندان میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک کالے میاں کی، دوسری گوری بی کی طرف

دار۔

"وہ آخر خدائے مجازی ہے۔ اس کا حکم نہ ماننا گناہ ہے۔" ایک پارٹی جمی ہوئی تھی۔

"کہیں کسی دلہن نے خود گھونگٹ اٹھایا ہے؟" دوسری پارٹی کی دلیل تھی۔

کالے میاں کو جودھپور سے بلوا کر دلہن کا گھونگٹ اٹھوانے کی ساری کوششیں ناکام گئیں۔ وہ وہاں گھوڑ سواروں میں بھرتی ہو گئے اور بیوی کو نان نفقہ بھیجتے رہے جو گوری بی کی اماں سمدھن کے منہ پر مار آتیں۔

گوری بی کلی سے پھول بن گئیں۔ ہر اٹھواڑے ہاتھ پیر میں مہندی رچاتی رہیں اور بندھے ٹکے ڈوپٹے اوڑتی رہیں اور جیتی رہیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ باوا کی مرن گھڑی آ پہنچی۔ کالے میاں کو خبر گئی تو نہ جانے کس موڈ میں تھے کہ بھاگے آئے۔ باوا موت کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھے۔ کالے میاں کو طلب کیا دلہن کا گھونگٹ اٹھانے کی باریکیوں پر مسکوٹ ہوئی۔

کالے میاں نے سر جھکا دیا۔ مگر شرط وہی رہی کہ حشر ہو جائے مگر گھونگھٹ تو دلہن کو اپنے ہاتھوں اٹھانا پڑے گا۔ "قبلہ کعبہ میں قسم کھا چکا ہوں میرا سر قلم کر دیجئے مگر قسم نہیں توڑ سکتا۔"

مغل بچوں کی تلواریں زنگھیا چکی تھیں۔ آپس میں مقدمہ بازیوں نے سارا کلف نکال دیا تھا۔ بس احمقانہ ضدیں رہ گئی تھیں، ایک انہیں کو کلیجے سے لگائے بیٹھے تھے۔ کسی نے کالے میاں سے نہ پوچھا تم نے ایسی احمقانہ قسم کھائی ہی کیوں کہ اچھی بھلی زندگی عذاب ہو گئی۔

خیر صاحب گوری بی پھر سے دلہن بنائی گئیں۔ ککیا اینٹ والا مکان پھر پھولوں اور شمامتہ العنبر کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ اماں نے سمجھایا۔ "تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی ضد پوری کر دو مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی، گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہو گا۔"

گوری بی سر جھکائے سنتی رہیں۔ کچی کلی سات سال میں نوخیز قیامت بن چکی تھی۔ حسن اور جوانی کا ایک طوفان تھا جو ان کے جسم سے پھوٹا نکلتا تھا۔

عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتہ پر مرکوز تھے۔ مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان کے تخیل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انہوں نے بیسیوں گھونگٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی، لونڈے بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی مگر گوری بی کے گھونگٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔ اس بار انہیں یقین تھا ان کی قسم پوری ہو گی۔ گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔

"گھونگٹ اٹھاؤ۔" کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آگیا۔

گوری بیگم غرور سے تمتائی سناٹے میں بیٹھی رہی۔

"آخری بار حکم دیتا ہوں۔ گھونگٹ اٹھا دو، ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی، اب جو گیا، پھر نہ آؤں گا۔"

مارے غصہ کے گوری بی لال بھبوکا ہو گئیں۔ کاش ان کے سلگتے رخسار سے ایک شعلہ لپکتا اور وہ منحوس گھونگٹ خاکستر ہو جاتا۔

بیچ کمرے میں کھڑے کالے میاں کوڑیالے سانپ کی طرح جھومتے رہے۔ پھر جوتے بغل میں دبائے اور پائیں باغ میں اتر گئے۔

اب وہ پائیں باغ کہاں؟ ادھر پچھواڑے لکڑیوں کی ٹال لگ گئی۔ بس دو جامن کے پیڑ رہ گئے تھے اور ایک جغادری بدگو بیلے چمبیلی کی روشیں، گلابوں کے جھنڈ شہتوت اور انار کے درخت کب کے لٹ پٹ گئے۔

جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹہ رنگ

چن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔

اب کے جو کالے میاں گئے تو غائب ہی ہو گئے۔ برسوں ان کا سراغ نہ ملا۔ ماں باپ رو رو کر اندھے ہو گئے' وہ نہ جانے کن جنگلوں کی خاک چھانتے پھرے۔ کبھی خانقاہوں میں ان کا سراغ ملتا۔ کبھی کسی مندر کی سیڑھیوں پر پڑے ملتے۔

گوری بی کے سنہری بالوں میں چاندی گھل گئی۔ موت کی جھاڑو کام کرتی رہی۔ آس پاس کی زمینیں مکان کوڑیوں کے مول بکتے گئے۔ کچھ پرانے لوگ زبردستی ڈٹ گئے۔ کنجڑے قصائی آن بسے' پرانے محل ڈھے کر نئی دنیا کی بنیاد پڑنے لگی۔ پرچون کی دکان' ڈسپنسری ایک مرگھلا سا جنرل سٹور بھی اگ آیا' جہاں المونیم کی پتیلیاں اور لپٹن چائے کی پڑیوں کے ہار لٹکنے لگے۔

ایک مفلوج مٹھی کی دولت رس کر بکھر رہی تھی۔ چند محتاط انگلیاں سمیٹنے میں لگی تھیں۔ جو کل تک ادوائین پر بیٹھتے تھے جھک جھک کر سلام کرتے تھے آج ساتھ اٹھنا بیٹھنا کسر شان سمجھنے لگے۔

گوری بی کا زیور آہستہ آہستہ لالہ جی کی تجوری میں پہنچ گیا۔ دیواریں ڈھے رہی تھیں۔ چھجے جھول رہے تھے۔ بچے کھچے مغل بچے افیون کا انٹا نگل کر پتنگوں کے پیچ لڑا رہے تھے۔ تیتر بٹیر سدھا رہے تھے۔ اور کبوتروں کی دموں کے پر گن گن کر ہلکان ہو رہے تھے۔ لفظ مرزا جو کبھی شان اور دبدبے کی علامت سمجھا جاتا تھا مذاق بن رہا تھا۔ گوری بیوی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چھکڑے میں جتی اپنے محور پر گھومے جا رہی تھیں۔ ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

ان کے لئے طرح طرح کے افسانے مشہور تھے کہ ان پر جنوں کا بادشاہ عاشق تھا۔ جونہی کالے میاں ان کے گھونگٹ کو ہاتھ لگاتے چٹ تلوار سونت کر کھڑا ہو جاتا۔ ہر جمعرات کو عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں تب سارا آنگن کوڑیالے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر سنہری کلغی والا سانپوں کا بادشاہ اجگر پر سوار ہو کر آتا ہے۔ گوری بی کی قرآت پر سر دھنتا ہے پو پھٹتے ہی سب ناگ رخصت ہو

جاتے ہیں۔

جب ہم یہ قصے سنتے تو کلیجے اچھل کر حلق میں پھنس جاتے اور رات کو سانپوں کی پھنکاریں سن کر سوتے ہیں چونک کر چیخیں مارتے۔

گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔ کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہو گا۔ ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔ انہوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہو گا؟

کاش یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی۔ مگر قسمت مسکرا رہی تھی۔

پورے چالیس برس بعد کالے میاں اچانک آپ ہی آن دھمکے۔ انہیں قسم قسم کے لاعلاج امراض لاحق تھے پور پور سڑ رہی تھی۔ روم روم رس رہا تھا۔ بدبو کے مارے ناک سڑی جاتی تھی۔ بس آنکھوں میں حسرتیں جاگ رہی تھیں جن کے سہارے جان سینے میں اٹکی ہوئی تھی۔

"گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔"

ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔ سہاگ کا چکتا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔ صندوق کھول کر پور پور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے۔

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موت کے فرشتے سے الجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا۔

"گوری بی گھونگٹ اٹھاؤ۔"

گوری بی کے ہاتھ اٹھے مگر گھونگٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑی سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھینچ گیا۔

❁❁❁

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے' اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں' کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے' اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS

Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/=